۱

امامیہ مشن رجسٹرڈ لکھنؤ کا ساٹھواں سالنامہ

خلافت و امامت

حصہ ششم

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

قیمت ۸ر محصول ۲ر

آپ مذہب کی حمایت کیونکر کرسکتے ہیں؟

(۱) امامیہ مشن کی ممبری قبول فرماکر۔

(۲) امامیہ مشن کے استقلال فنڈ کے ٹکٹ خرید فرماکر۔

(۳) امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل خرید فرماکر۔
جس سے آپ کے مذہبی معلومات میں اضافہ ہوگا اور مشن کی امداد بھی ہوجائے گی۔

(۴) امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل ہم سے رعایتی قیمت پر خرید فرماکر غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرکے (جیسا کہ بعض ہمدردان ملت عامل ہیں)

امامیہ مشن ۲ سال کے اندر اندر ۶۴ تبلیغی رسائل شائع کرچکا ہے۔
جس کی کل تعداد ایک لاکھ سے زائد ہوچکی ہے۔

ہر سال عشرہ ماہ محرم میں اردو ہندی انگریزی رسائل غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرتا ہے لکھنؤ کی اچھوت کانفرنس میں دو زبانوں میں مفت رسائل تقسیم کرتا ہے۔

(خادم مذہب)
آنریری سکریٹری امامیہ مشن نخاس لکھنؤ

خلافت و امامت

حصہ ششم

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

امامیہ مشن کی چوہتویں خدمت

خلافت امامت حصہ ششم

اس سے پہلے "خلافت امامت" کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے آخری دو حصوں میں "آزاد خیال شیعہ" کا وہ سلسلۂ مقالات ہے جو جناب بزمی ایم۔ اے اور م۔ ح کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

اس مقالہ کی اشاعت کے بعد ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی کہ اسے آگے بڑھایا جائے۔ مگر چونکہ اکثر احباب کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ بزمی صاحب، م۔ ح کا مضمون جو مخالف نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ نیز بعض دوسرے مضامین جو اس سلسلہ میں شائع ہوئے ہیں وہ بھی قابل معلوم ہوتے ہیں کہ محفوظ کر دیئے جائیں۔ اس لئے یہ چھٹا حصہ شائع کیا جاتا ہے اس میں بزمی صاحب اور م۔ ح کا جو مضمون درج ہے اس کا مکمل جواب اس سے پہلے دو حصوں میں ملے گا۔ والسلام

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی سکریٹری امامیہ مشن

نخاس۔ لکھنؤ

محرم ۱۳۵۸ھ

مسئلہ خلافت و امامت

انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے

(نوشتۂ عالیجناب ابو سعید صاحب بزمی - ایم اے)

مذہب کے کسی اختلافی موضوع پر قلم اٹھانا بالعموم مفید و نتیجہ خیز نہیں ہوتا کیونکہ اس قسم کے مباحث پر نہ تو ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتا ہے اور نہ انھیں اس کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں مذہب انسانی معاشرت میں اس طرح دخیل ہے کہ ایک انسان کو تبدیلی مذہب کے تصور سے بھی لرزہ آنے لگتا ہے کیونکہ ہمارے یہاں مذہب کسی شخص کے انفرادی ایمان و ضمیر سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ماں، باپ بیوی بچے، اعزہ و احباب نیز اس معاشرتی دائرہ سے ہے جس میں ایک آدمی زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر مذہب کا دائرہ اتنا تنگ اور محدود ہے کہ ایک وہابی اپنے عقائد و خیالات کو ایک جدا گانہ اور مستقل مذہب کی نوعیت دیتا ہے (گو وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرے) اور اپنے مذہبی امتیاز کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کے لئے بہت سی جزوی اور فروعی باتوں میں حد درجہ غلو برستے

سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ نماز میں چلا کر آمین کہنے کو فرض کا مرتبہ قرار دیتا ہے اور اپنے مخالف عقائد رکھنے والوں کی ضد میں عام اخلاق انسانی کی اُن حدود کو بھی پھاندنے کی کوشش کرتا ہے جن کو کسی حیثیت سے بھی معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً عام انسانی اخلاق کب اس کا مقتضی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو گالی دیں، بُرا بھلا کہیں، اس پر ہنسیں۔ اُس کا مضحکہ اُڑائیں، محض اس لئے کہ ہمارے اور اُس کے مابین بعض باتوں میں رائے اور ضمیر کا ایماندارانہ اختلاف ہے لیکن ایک وہابی یا غیر مقلد اس کی پرواہ نہیں کرتا اور وہ آزادی کے ساتھ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی جیسے ائمہ کبار کو علانیہ مورد طعن و تشنیع بنانے میں لطف و راحت محسوس کرتا ہے بد قسمتی سے ہندوستان کا جہل و تعصب اس باب میں اور بھی بڑھا ہوا ہے، یہاں ہم ابھی اپنے مخصوص پیر و مرشد اور اپنے مخصوص مسجد و مُلّا کے جھمیلوں ہی سے آزاد نہیں ہوئے ہیں چہ جائیکہ مذہب کے اہم اختلافات پر عقل و دیانت کے ساتھ سکون قلب سے غور کر سکیں۔ پھر یہ چیز کچھ جُہلا ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دیوبند اور ندوۃ کے فارغ التحصیل حضرات سے لیکر انگریزی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سند یافتہ فضلا تک سب اسی جہل میں مبتلا ہیں، چنانچہ میرے ایک دوست

جو ایم اے کے آخری سال میں میرے شریک درس تھے صرف اتنی سی
بات پر حد سے زیادہ برہم ہو گئے کہ میں نے اس بات کے ماننے میں
تامل کیا تھا کہ کعبہ کی چھت کے اوپر سے کوئی پرندہ اڑ کر نہیں جا سکتا۔
گو وہ نہایت سنجیدہ نوجوان تھے۔ کلاس میں اُن کا شمار ذہین طلبا
میں ہوتا تھا۔ عام مطالعہ بھی اُن کا اچھا تھا۔ لیکن مذہبی رواداری
اور وسیع النظری کی وادی میں وہ اسی طرح کے "کٹھ ملا" تھے جس کے
ایک ہاتھ میں مسجد کا بدھنا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں استنجے
کا ڈھیلا۔

پھر میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی وسیع
القلب اور وسیع الخیال انسان بستا ہی نہیں بلکہ صرف اتنا عرض کرتا
ہوں کہ اُن کی تعداد آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ اور اس
لئے صرف اس قسم کے مٹھی بھر افراد کے سامنے "حقائق و معارف"
کے دفتر کھولنا عمومی نقطۂ نظر سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔
چنانچہ ۱۹۳۵ء میں "امامت و خلافت" پر میرا جو مضمون نگار جولائی
میں شائع ہوا تھا اُس پر میرے ایک نہایت ہی مخلص شیعہ دوست
نے جو ایم اے میں میرے شریک درس بھی رہ چکے ہیں اپنی انتہائی
وسیع النظری، وسیع القلبی اور استثنائی رواداری کے باوجود مجھے خط

میں لکھا تھا ۔ "ابر فریبی کے اعتبار سے آپ کا مضمون بہت کامیاب ہے"۔

اور اس لئے میں اس مقالہ میں کتنی ہی دیانت داریانداری کے ساتھ بحث کروں اور کتنے ہی اطمینان بخش انداز سے اپنے مقصد کو پیش نظر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں ۔ لیکن لکھنؤ میں "مدح صحابہ" کا قضیہ پھر بھی بدستور باقی رہے گا اور ایک مجتہد سے لیکر سڑک پر چلنے والے راہگیر تک کے خیالات میں رتی برابر کوئی فرق نہ آئیگا یہی وجہ تھی کہ اگرچہ "امامت وخلافت" کا مسئلہ تقریباً دو سال سے ناسور کی طرح "نگار" کے صفحات پر رِس رہا ہے ۔ اور اس دوران میں کئی مرتبہ خود میرا دل بھی چاہا کہ اس پر اپنے افکار وخیالات کو اہل علم کے سامنے پیش کروں ۔ میرے بعض بے ریا دوستوں نے مجھ سے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے اصرار بھی کیا ۔ "نگار" کے مدیر محترم نے بھی اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کو میرے لئے ناگزیر قرار دیا ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میری ہمت نہ پڑی کہ اس پر کچھ لکھوں ، اس لئے کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال" کا نظریہ ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا ہے ۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں "نگار" میں

جو مضامین شائع ہوئے ہیں اُن سے جو اثر مترتب ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں حضرات کو جدید تاویلات پر غور کرنے اور اپنے مقصود کو واضح سے واضح تر کرنے کے لئے استدلال تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرنا پڑ رہی ہے ۔ خیر اُن لوگوں کو تو چھوڑ ہی دیجئے جو ہر ایسے موقع پر اپنی گردن کی رگوں، منھ کے جھاگ، آنکھوں کی سرخی اور چہرہ کی تمتماہٹ کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے ۔ لیکن وہ لوگ بھی جو آزاد خیالی اور وسیع المشربی کی دوڑ میں اپنے کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک کہنے میں پس وپیش نہیں کرتے جب شیعہ سنی کے اختلافی مسائل پر آتے ہیں تو "قوم کی عزت" کی خاطر وہی سب کچھ کرتے اور کہتے نظر آتے ہیں جو نہ کرنا اور نہ کہنا چاہیئے ۔

تاہم میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں کوئی حلقہ ایسا ہے جو مذہبی امور پر نسبتاً زیادہ سنجیدگی اور سکون قلب کے ساتھ بحث کر سکتا ہے تو وہ شاید صرف "نگار" کے خریداروں ہی کا حلقہ ہوگا ۔ ورنہ یوں تو وہ سب کچھ الحاد و زندقہ ہے جس کی تائید ندوہ تھانہ بھون، بریلی یا دیوبند جیسی خانقاہوں سے نہ ہوتی ہو ۔

میں اپنے اس محاکمہ کی تائید میں دلائل پیش کرنے سے قبل مندرجہ ذیل تنقیحات قائم کرتا ہوں۔

۱۔ کیا عام مذاہب عالم کا بالعموم اور اسلام کا بالخصوص یہ دعویٰ ہے کہ وہ روئے زمین پر بسنے والے ہر انسان کی دنیوی اور اُخروی صلاح و فلاح کا پیغام لیکر آیا ہے۔ بالفاظ دیگر کیا ہر مذہب بالعموم اور اسلام بالخصوص اس کا مدعی ہے کہ وہ انسان کی معاشرتی، سیاسی، ذہنی اور اخلاقی بھلائی کا مکمل پروگرام رکھتا ہے اور یہ کہ دنیا کا کوئی اور مذہب اس سے زیادہ عمدہ، زیادہ قابل قبول اور عام انسانوں کے لئے زیادہ مفید پروگرام پیش نہیں کرسکتا؟

۲۔ کیا کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہی کہ وہ انسان کے انفرادی، و معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرتا ہو؟

۳۔ کیا کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے جو معمورۂ ارضی پہ بسنے والے تمام انسانوں کے لئے یکساں مفید اور قابل عمل نہ ہو۔ اور جس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ اور خواہش پر ضرب لگتی ہو؟

۴۔ کیا کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے

جس کا کوئی اہم ترین اور بنیادی فیصلہ دنیا کی عقل عمومی کے خلاف ہو اور دنیا کے بسنے والوں کو اُن کے کسی جائز حق سے محروم کرنا چاہتا ہو؟

اب مناسب ہوگا کہ ان چاروں تنقیحات میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کی جائے۔

پہلی تنقیح

یہ تنقیح اس قدر واضح و روشن ہے کہ اسے کسی تفصیلی بحث و نظر کا محتاج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس شخص میں معمولی سی عقل و بصیرت بھی ہوگی وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو زیادہ منور و تابناک بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ روئے زمین کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو دنیا کی تمام بھلائیوں اور خوبیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کا مدعی نہ ہو۔ چنانچہ آج جب اچھوت قوم نے اُن معاشرتی اور مجلسی مظالم کے خلاف احتجاج کیا جو برہمنوں اور پنڈتوں کی جانب سے صدیوں سے اُن پر توڑے جا رہے ہیں تو ہندوستان کے

ہر گوشہ سے ہندو مت کے خیر خواہ یہ کہتے ہوئے سنائی دینے لگے
کہ "اصل ہندو دھرم اس الزام سے بری ہے - اور یہ ظلم و
زیادتی بعد کے خود غرض اور جاہ پرست برہمنوں کی ذاتی اختراع
و ایجاد ہے۔"
یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب کے پاس انسانی زندگی کے ہر شعبہ
کو . . . استوار و بہتر بنانے کا کوئی مکمل لائحۂ عمل نہیں ہے وہ
رفتہ رفتہ یا تو فنا ہو رہے ہیں یا اپنی قدیم شکل کو دانستہ یا نادانستہ
طور پر بدل رہے ہیں - دور نہ جائیے خود آپ کے ہندوستان
میں ہندو مذہب میں جو تغیرات روز بروز ہو رہے ہیں وہ آپ
کی آنکھوں کے سامنے کی بات ہے - کل تک نہ تو کوئی غیر ہندو ہندو
بنایا جا سکتا تھا اور نہ کوئی ہندو کسی غیر مذہب کو قبول کر لینے کے
بعد ہندو مذہب میں دوبارہ داخل ہو سکتا تھا - لیکن آج کھلم کھلا
اس عقیدہ کے خلاف بغاوت کی جا رہی ہے - اور سوامی دیانند جی
کے پیرو علانیہ اس کا پرچار کر رہے ہیں کہ نہ صرف مرتد ہندو
دوبارہ ہندو بنایا جا سکتا ہے بلکہ مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی
غرض کہ ہر مذہب و ملت کے فرد کو ہندو مت کے آغوش میں پناہ دی
جا سکتی ہے - علاوہ ازیں ہندو مذہب میں بت پرستی، توہم پرستی

بطل پرستی اور اسی قسم کے سیکڑوں ایسے نقائص ہیں جن کے خلاف آج علانیہ طور پر پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اصل ہندو دھرم ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ چنانچہ بنگال میں برہمو سماج اور پنجاب میں آریہ سماج انھیں مساعی کا نتیجہ ہیں۔

اس چیز کو دلائل و براہین سے واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام کا دعوی بھی ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ دنیا میں ہر انسان کی صلاح و فلاح کے لئے خدا کی "آخری آواز" ہے اور ایک ایسا پروگرام خدا کی طرف سے لیکر آیا ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیوی و اخروی ہر اعتبار سے نشو و ارتقاء کے اعلی مدارج تک پہونچ سکتا ہے۔

دوسری تنقیح

اس تنقیح پر بھی مجھے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ ڈاکٹر امبیدکار کے تبدیل مذہب کے اعلان کے بعد سے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اس موضوع پر اتنی بحث و تمحیص ہوئی ہے کہ اب اس سلسلہ میں غالبًا کسی مزید تحقیق و تفتیش کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ حتی کہ پنڈت مالوی

جیسا متعصب الخیال و قدامت پرست ہندو دھرم آج بھی کسی نیچ ذات" کے ہندو کو اپنے خاندان میں قرابت و عزیز داری کا شرف دینے کے لئے تیار نہیں) یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ آج کل " اچھوت" کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اُسے اصلی ہندو دھرم سے کوئی واسطہ نہیں ـــــ گویا انھیں اس حقیقت کے آگے مجبوراً سپر ڈالنا ہی پڑی کہ "کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرے" اور اس لئے ہندو دھرم کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے لازم ہوا کہ اُسے اُن تمام امور سے پاک و صاف ظاہر کیا جائے جن کی بنا پر اس کرۂ ارض پر بسنے والی چھ کروڑ مخلوق کے عام انسانی حقوق پر دن کی روشنی میں ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔

آج دنیا میں روس کی اشتراکیت عوام کے لئے اتنی جاذب نظر کیوں بنی ہوئی ہے ؟ اور وہ کون سی وجہ ہے جس کی بنا پر شہنشاہیت پرست ممالک کے اتنے شدید بندھنوں کے باوجود یہ خیالات روئے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں ؟ اور وہ کون سی محرکات

دوامی ہیں جن کی وجہ سے عامۃ الناس اپنی آبائی روایات، اپنے مسلک و مذہب اور اپنے معتقدات کو اشتراکیت کی پیروی میں قابل ترمیم قرار دے رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے مذہب نے سرمایہ پرستوں کے بقاؤ تحفظ کے لئے جو تدابیر اختیار کر رکھی ہیں وہ قطعاً ناجائز اور ظالمانہ ہیں۔ اور اس لئے کوئی ایسا مذہب حقانیت و صداقت کا صحیح دعویدار قرار نہیں دیا جا سکتا جو موجودہ سرمایہ پرستی کا حامی و ناصر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ میں عیسائیت کا صرف نام رہ گیا ہے ورنہ کسی شخص کے دل کے اندر اس کی وہ عظمت و بزرگی باقی نہیں رہی جو مذہب ہونے کی حیثیت سے اُسے حاصل ہونا چاہیئے۔

الغرض یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہیئے کہ اُس سے کسی انسانی جماعت کا کوئی حق غصب نہ ہوتا ہو۔

تیسری تنقیح

مذکورۂ بالا دوسری تنقیح کے واضح ہو جانے کے بعد یہ تنقیح کسی

بحث و تشریح کی محتاج نہیں رہتی ۔ اس لئے کہ کسی مذہب کا "انسان
کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت"
نہ کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ الوہی اور الہامی نہیں
ہے ۔ کیونکہ خدا کی طرف سے کوئی ایسی چیز اپنے بندوں کے سر نہیں
منڈھی جا سکتی جو اُن کے کسی ایک جائز حق کو بھی سلب کرتی ہو عقل
سلیم اس بات کو کسی صورت سے نہیں مان سکتی کہ انسان پر ظلم و
بے انصافی کے پہاڑ توڑنے کے لئے خدا کی جانب سے کوئی مذہب بھیجا
جائے اور اس لئے اگر کسی مذہب کے اصول و نظریات تمام انسانوں
کے لئے یکساں مفید و قابل عمل نہ ہوں ۔ یا اُن سے کسی گروہ یا جماعت
یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب لگتی ہو تو بلا پس و
پیش یہ فیصلہ دیا جا سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب سرے سے الہامی نہیں
ہے، یا کم از کم اُس کا وہ حکم غیر الہامی ہے جو عام انسانوں کے لئے کسی
جائز و معقول شکایت کا باعث ہو۔

چوتھی تنقیح

دوسری اور تیسری تنقیح کے بعد اس تنقیح کے قائم کرنے کی بظاہر
کوئی ضرورت نہ تھی ۔ لیکن چونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا ہر پہلو

نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی میں آجائے اس لئے میں نے
اس تنقیح کو قائم کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن اس پر کسی تفصیلی بحث
کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ بالکل روشن حقیقت ہے کہ اگر کسی
مذہب کا کوئی بنیادی اور اساسی عقیدہ ایسا ہو کہ اُسے عقل
عمومی جائز قرار نہ دیتی ہو تو ہم یا تو اس عقیدہ کو مذہب کا بنیادی
و اساسی عقیدہ ماننے سے انکار کر دیں گے اور یا سرے سے
اُس مذہب کے الہامی ہونے سے منکر ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگر
کوئی مذہب انسان کو "خیر و نیکی" کے اتباع سے باز رکھتا ہے
تو اُس کے دائرہ سے علیحدگی اختیار کر لینا انسانیت کا سب سے
پہلا فرض ہے۔

لیکن یہاں میں جس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دینا چاہتا
ہوں وہ "عقل عمومی" کا لفظ ہے "عقل عمومی" سے میری مراد
وہ معمولی فہم و فراست ہے جس سے روزمرہ کے کاروبار میں ہم
کام لیتے ہیں اور جس کے ذریعہ ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو
پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے
ساتھ متفق ہوتے ہیں۔ اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاداً
نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً

"سچ بولنا اچھا ہے" یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ یا اسی طرح "انسان کا قتل کرنا وحشیانہ فعل ہے"۔ یا "جھوٹ بولنا بری بات ہے" اس نوع کے تمام اصول کلیات ایسے ہیں کہ جنھیں ہماری "عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے۔

یہ میں نے اس لئے عرض کر دیا کہ کہیں اس موقع پر "عقل و نقل" کے اُن مباحث کی طرف ذہن منتقل نہ ہو جائے جن سے معتزلہ وغیرہ کی تصانیف بھری پڑی ہیں۔ اس لئے کہ ان مباحث میں "عقل" کے لفظ سے بالعموم جس مفہوم کو مراد لیا گیا ہے وہ استدلال و قیاس آرائی کی وہ شکل ہے جس کے بعد مذہب سائنس و فلسفہ کی موشگافیوں میں پھنسکر صرف گہرے فلسفیوں کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہتا۔ اور عوام کی نظروں میں اُس کا ہر مسئلہ ایک عقدہ لانیحل بنکر رہ جاتا ہے لیکن میری مراد یہاں اس قسم کے "استدلال وقیاس آرائی" سے نہیں ہے بلکہ اس کے بخلاف میرے پیش نظر استدلال و استنتاج کی وہ سادہ و سلیس صلاحیت ہے جس سے ہم عملی زندگی کے روزانہ کاروبار میں مدد لیتے ہیں۔ اور اس لئے گو مذہب کو "عقل" سے علحدہ رکھنے کی کتنی ہی کوشش کی گئی ہو لیکن یہ کسی کا عقیدہ نہیں ہے کہ مذہب کے اصول و ضوابط کو

"عقل عمومی" سے کوئی علاقہ وسروکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو پھر مذہب کے دوسرے معنی "جنون ودیوانگی" کے سوا اور کچھ نہ ہوسکیں گے۔

ان چاروں تنقیحات کو بخوبی ذہن نشین کرلینے کے بعد اب آپ حضرت علی کی "الوہی خلافت" کے عقیدہ پر غور کیجئے۔ دیکھیے "الوہی خلافت" کا مطلب یہ ہے کہ :-

"خداوند کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریم کے بعد اُن کے داماد حضرت علی خلیفہ ہوں۔ اور علی کے بعد اُن اولاد میں سے کسی کو یہ منصب جلیل تفویض کیا جائے۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے"

اب اگر آپ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط کر سکتے ہیں:-

ا- خلافت وامامت حضرت علی کی نسل کے لئے مخصوص ہے۔

۲- خلیفہ یا امام کی وفات پر اس کی جانشینی کے لئے پیش رَو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں پیش رَو کا کوئی اور قریب ترین عزیز ہوتا اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہانِ مطلق العنان و مختار کے یہاں ولیعہدی کے لئے۔

۳۔ اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی اُن میں سے کوئی خلافت کی مسند کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔

۴۔ دنیا کے تمام مسلمان حضرت علی کی نسل کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔

۵۔ چونکہ رسول کے بعد علی اور اُن کی اولاد ہی خلافت و امامت کی حقدار ہے اور وہی اولو الامر، آقا اور مولا ہیں۔ اس لئے روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کے لئے یہ فرض ہے کہ وہ ابد الآباد تک "آل علی" کے ہر اشارہ پر بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کرتا رہے۔

۶۔ اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اُس کو زیر بحث نہیں لایا جائیگا بلکہ علی کی اولاد میں سے ولیعہدی کے طریقِ اصول کے بموجب کسی "حقدار" کو مسندِ خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائیگا۔

اب ان عقائد کو بغور دیکھئے اور معلوم کیجئے کہ آیا یہ عقائد آپ کی "عقل عمومی" کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے مخالف تو نہیں؟ یعنی آیا ان عقائد کو مان لینے کے بعد انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت ممکن ہو سکے گی؟ آیا اس قسم کا عقیدہ معمورۂ ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کے لئے یکساں مفید اور قابلِ عمل

ہو سکے گا؟ آیا اُس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی جائز مطالبہ یا خواہش کو ضرب پہونچے گی؟ اور کیا یہ عقیدہ دنیا کے بسنے والوں کو انکے کسی جائز حق سے محروم کرنے کا موجب تو نہ ہوگا؟

دیکھیے ان عقائد کا منشاء یہ ہے کہ بانی اسلام کی خواہش یہ تھی کہ اُن کی وفات کے بعد مسلمانان عالم پر اُن کی نسل تا قیام قیامت سلطان مطلق کی حیثیت سے حکمرانی کرے۔ اور اُن کی نسل کے افراد کے ہوتے ہوئے روئے زمین کا کوئی مسلمان مسند خلافت کا امیدوار نہ ہو سکے۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اجتماعی اور عمرانی نقطۂ نظر سے نبی کریم نے دنیا کے سامنے دو چیزیں پیش کیں۔

(۱) غیر مسئول مطلق العنان حکومت جو خلیفہ کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے۔

(۲) نسلی امتیاز" جس کے ماتحت اولاد رسول دنیا کے تمام انسانوں پر ابد الآباد تک حکمراں ہونے کی حقدار ہے اور آل علی کا ہر بچہ ماں کے پیٹ سے یہ استحقاق لیکر پیدا ہو کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی گردنیں اس کے سامنے عقیدت و احترام کے ساتھ خم ہو جائیں محض اس لئے کہ وہ کہے "از آل علی" ست نہ کہ اس لئے کہ اُس نے اپنی ذاتی صلاحیت و استعداد اور خدمت و ایثار کے ماتحت یہ ہر دلعزیزی حاصل کی ہو۔

اب پوری سنجیدگی اور انصاف پسندی کے ساتھ غور کیجیے کہ اگر کوئی مذہب دنیا پر اس قسم کے مطلق العنان نسلی امتیاز کو مسلط کرنا چاہے تو کیا وہ مذہب

انسانی حقوق کے احترام وتحفظ کے تمام مذکورۂ بالا دعاوی نیز عقلِ عمومی کے اعتبار سے دنیا کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے؟ اور کیا اسلام کے اُن کھلے ہوئے اور واضح احکام کی موجودگی میں جن میں انسانی مساوات، حریت شخصیہ، آزادی فکر و رائے اور نسل و نسب کے امتیازات کے انعدام پر بار بار زور دیا گیا ہے اس عقیدہ کو تسلیم کرنا اسلام کے اصولی عقائد میں ناقابل فہم تضاد و تباین کو داخل کرنا نہیں ہے؟

پھر ممکن ہے کہ آج سے پانسو برس یا پانچ ہزار برس پہلے اس مسئلہ میں اختلاف آراء ہو سکتا۔ لیکن سنہ ۱۷۸۹ء کے بعد سے فرانس کے ہمہ گیر انقلاب نے دنیا کے بچہ بچہ کو ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی کی اس بنیادی اور ابتدائی صداقت سے روشناس کر دیا ہے۔ اور آج مشرق سے لیکر مغرب تک کوئی دماغ ایسا نہ ملیگا جو اس بات کا خواہاں ہو کہ دنیا کو سنہ ۱۷۸۹ء سے پہلے کے زمانہ کی طرف لوٹ جانا چاہئے۔ آج دنیا میں چار ڈکٹیٹر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی ایک اس بات کا خواہشمند نہیں ہے کہ قرون وسطیٰ کی سی خود مختاری اور مطلق العنانی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ گزشتہ جنوری میں مسولینی نے روس کے ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں نہ تو اشتراکیت کے سماجی نظام کا قائل ہوں اور نہ موجودہ جمہوریت

کا مفہوم میرے دل کے لئے باعث کشش ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں دنیا کو ایک مرتبہ پھر اُس غیر مسئول و مختار مطلق عہد کی طرف لوٹالے جانا چاہتا ہوں جو انقلاب فرانس سے پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔

آج کل ڈکٹیٹروں کے موجودہ غلبہ و تسلط کو دیکھتے ہوئے کسی قدر غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس لئے اس بات کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ڈکٹیٹر اور آٹوکریٹ رولر (مطلق العنان فرمانروا) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ڈکٹیٹر قوم کی خواہشات و جذبات کی زندہ تصویر ہوتا ہے اور وہ قوم کے عمومی مطالبہ سے ایک انچ تجاوز نہیں ہوتا۔ اُس کی زندگی چوبیس گھنٹے ایک ان تھک عملی انسان کی طرح بسر ہوتی ہے جو محض اپنی سابقہ قربانیوں اور حد سے بڑھے ہوئے حب وطن اور حب قوم کی وجہ سے اپنے اہل ملک کی آنکھ کا تارا بنا ہوتا ہے۔ وہ قوم کی صلاح و فلاح کے لئے تمام امکانی تدابیر عمل میں لاتا ہے اور اُس کا دماغ و جسم ایک لمحہ کے لئے بھی اُس عیش و تنعم سے دوچار نہیں ہوتا جو شاہان ماسبق کے حرم سراؤں کی خصوصیت خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر اپنے ذاتی رجحانات اور ذاتی خبط کے بموجب کام نہیں کرتا بلکہ قوم کی عمومی خواہشوں کا ایک

مکمل نقشہ ہر وقت اُس کے دماغ میں موجود رہتا ہے ۔ الغرض ایک ڈکٹیٹر اور ایک آٹوکریٹ رولر میں بعد المشرقین ہے اور اس لئے ان دونوں کو باہم مخلوط کر کے بحث کو اُلجھانا نہ چاہیئے ۔

علاوہ ازیں مسولینی اور ہٹلر کی آمریت کے اصول کو دنیا قابل قبول بھی نہیں سمجھتی ۔ خود اُن کی اپنی قوم بھی پوری طرح اُن کے حق میں نہیں ہے اُن کی زندگی ہر لمحہ خطرہ میں ہے ۔ اور گو سر دست اُن کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے لیکن بین الاقوامی سیاسیات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ اُن کی شہرت و عزت کی بنیادیں بہت ہی کمزور اور پتلی زمین پر رکھی گئی ہیں ۔ اور وہ وقت جلد آنے والا ہے جب خود انھیں کی قوم اُن کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی ۔

پس اگر " الوہی خلافت " کے مذکورۂ بالا استحقاق کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اسلام دنیا میں غیر مسئول مطلق العنانی اور ناجائز نسلی امتیاز کو قائم کرنا چاہتا ہے ۔ ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کو یوں سمجھئے کہ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے آج ہر ہٹلر یہ طے کر دے کہ " مجھے خدا کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ میں اور میرے بعد میری اولاد نسلاً بعد نسلٍ ابدالآباد تک جرمن قوم پر فرمانروائی کرے "

فرمائیے، اگر آج ہٹلر، مسولینی، مصطفٰے کمال یا اسٹالن کی طرف
سے اس قسم کا دعویٰ آپ کے گوش گزار کرایا جائے تو آپ اس کا خیر مقدم
کس طرح کرینگے؟ اور آپ اس قسم کے اعلان کو دنیا کے لئے برکت
سمجھیں گے یا لعنت؟ ـــــ خیر آپ تو برکت و لعنت کا سوال طے کرنے
میں سلف کے اقوال ہی کو نوٹ پلٹ کرتے رہیں گے لیکن یورپ کے
باشندے جو اجتماعی اور شخصی حریت کے مفہوم سے بخوبی آشنا ہوچکے ہیں
بہت جلد اصل حقیقت کو اپنے اس ڈکٹیٹر کے گلے اتار دیں گے۔۔اور
ابھی "نگار" کا دوسرا پرچہ شائع بھی نہ ہونے پائیگا کہ اخبارات میں
آپ موٹے موٹے حروف سے لکھی ہوئی یہ سرخی پڑھ لیں گے۔
"یورپ کے ایک مخبوط الحواس ڈکٹیٹر کی لاش دریائے رائن کے
سپرد کر دی گئی"

میں اس وقت آیات و احادیث سے اس حقیقت کو ثابت
کرنا نہیں چاہتا کہ اسلام جمہوریت کا مدعی ہے یا نسلی مطلق العنانی
کا۔ میں تو آپ کی عقل عمومی سے یہ سیدھا سا سوال کرتا ہوں کہ اگر
آپ اسلام کو سچا اور الہامی مذہب قرار دیتے ہیں تو کیا آپ کے نزدیک
اس کا ایک بنیادی اور اساسی عقیدہ اس نوع کا ہو سکتا ہے؟

کیا اسلام دنیا کے رہنے والوں پر اس طرح ایک نسل کو قیامت تک کے لئے فرمانروائی کرنے کا ٹھیکہ دے سکتا ہے؟ اور اگر اسلام ایسا حکم دے تو کیا آپ اُسے الہامی اور الوہی مذہب قرار دینگے؟

دیکھئے اگر آج "الوہی خلافت" کا مسئلہ طے شدہ ہوتا اور اسلام میں "آلِ علیؓ" کو بلاچون وچرا استحقاق کے بعد دیگرے خلیفہ تسلیم کرلیا جایا کرتا تو ہر سید کے دماغ آسمان پر ہوتے۔ وہ اپنے کو حکمراں خاندان کا فرد سمجھتا، اور شاید آج راقم الحروف بھی اس مساوی سطح پر ناظرین "نگار" سے مخاطب ہونے کی "ذلت" گوارا نہ کرتا۔ اس لئے کہ بہرحال سید ہونے کی تھوڑی بہت قیمت تو اس خاکسار کو بھی ملتی ہی۔

پھر یہ چیز کوئی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق صرف میری ذاتی پیشینگوئی یا قیاس آرائی سے ہو۔ جی نہیں دور نہ جائیے۔ اپنے ہندوستان ہی میں اُن فرقوں کو دیکھئے جن کے یہاں اس قسم کا "الوہی استحقاق" تسلیم شدہ ہے۔ اور پھر اندازہ کیجئے کہ اگر یہی چیز سارے اسلامیانِ عالم پر مسلط کردی جاتی تو ہم مسلمانوں کی کیا دُرگت ہوتی۔

آپ ہزہائینس سر آغا خاں سے ناواقف نہ ہوں گے۔ یہ اہلِ تشیع کے اُس مخصوص فرقہ کے "امام" ہیں جو خوجہ فرقہ کہلاتا ہے

آپ براہ راست حضرت علی سے نسلی تعلق رکھتے ہیں۔ خوجہ فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ آغا خاں خدا کی طرف سے مذہبی اور دنیوی دونوں اعتبار سے کل مسلمانان عالم کے سردار و آقا ہیں اور اُن کے بعد اُن کے صاحبزادہ پرنس علی خاں اس سرداری و خواجگی کے مستحق ہیں ــــ

بعینہ وہی عقیدہ جو اس وقت زیر بحث ہے اس کا نتیجہ کیا ہے؟

آغا خاں اور اُن کے صاحبزادے پرنس علی خاں کی زندگیوں سے کون ناواقف ہے؟ یورپ کی حسن بار و حسن پاش رنگینیوں میں وہ رہتے ہیں۔ اُن کی بیویاں بے پردہ ہیں۔ ریس (گھوڑ دوڑ) میں وہ کروڑوں روپیہ ہر سال لٹا دیتے ہیں۔ ایک ایک لاکھ روپے کا ایک ایک گھوڑا خریدا جاتا ہے۔ غرضکہ زندگی کا وہ کون سا عیش ہے جو انھیں حاصل نہیں؟ لیکن اس کے باوجود خوجہ فرقہ مذہبی اعتبار سے اُن کا غلام ہے اُن کے غسل کا پانی حفاظت سے جمع کیا جاتا ہے اور بیماروں کو شفا کی خاطر پلایا جاتا ہے۔ اور کیوں نہ پلایا جائے؟ جبکہ نور محمدی سلسلہ بسلسلہ اُن ہیں منتقل ہوا ہے ــــ اُن کے پاؤں دھو کر پیئے جاتے ہیں۔ اُن کے قدموں کے نیچے کی خاک کو خاک شفا قرار دیا جاتا ہے۔ المختصر وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جسے سنکر آپ کو یقین بھی بمشکل آئیگا۔

آغاخاں کو چھوڑیے۔ اگر کبھی بمبئی جانے کا اتفاق ہو تو "سیدنا" پیر سیف الدین طاہر کی بارگاہ جلال میں قدم رکھیے۔ آپ بھی "آل رسول" ہیں۔ براہ راست حضرت علی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور "الوہی امامت" کی وجہ سے ساری دنیا کے بوہرہ فرقہ کے روحانی اور دنیوی پیشوا ہیں۔ ہر بوہرہ پر فرض ہے کہ ہر سال آپ کی "بارگاہ" کو ایک مخصوص ٹیکس (جس کا کوئی خاص شرعی نام ہے) ادا کرے۔ پھر عقیقہ، ختنہ، نکاح اور موت کے مواقع پر بھی مختلف قسم کے ٹیکس مقرر ہیں جو اس "بارگاہ" کو دیئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس وقت کئی کروڑ روپیہ کی رقم کے واحد مالک "حضور سیدنا" ہیں۔ آپ ایک نہایت پر تکلف و عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کئی کئی موٹریں ہر وقت آپ کی سروس میں رہتی ہیں۔ دسترخوان پر ہارون و مامون کے الوان نظر آتے ہیں فرسٹ کلاس یا غالباً اسپشل سیلون میں آپ سفر کرتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں لوگ سچ مچ آپ کے قدم لیتے ہیں۔ اور ماشاء اللہ شرع محمدی کے بموجب آپ کی چار بیویاں بھی ہیں۔ ممکن ہے کچھ لونڈیاں بھی ہوں۔

کیا ان مناظر کو دیکھنے کے بعد آپ یہ نتیجہ بآسانی نہیں نکال سکتے کہ اگر الوہی خلافت کے مذکورۂ بالا مسئلہ پر عامتہ المسلمین کا ایمان

ہوتا تو پھر اسی قسم کا ایک خلیفہ یا امام ہم سب "ایمان والوں" کا بھی ہوتا۔ اور ہم سب چالیس کروڑ فرزندان توحید ایک "ا" پیسے "آغا خان" کے مطیع و منقاد ہوتے جو پیرس وینیلز میں گھوڑے دوڑایا کرتا۔ اور ہماری جیبوں سے ہر سال کروڑوں بلکہ اربوں "چہرہ شاہی کلدار" وصول کرتا رہتا۔

پھر یہ طریق عمل کچھ میرے ہی نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ بلکہ خود بوہروں اور خوجوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے دماغ پیدا ہو گئے ہیں جو علانیہ اس چیز سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں۔ بوہروں میں تو ایک جماعت ہی ایسی تشکیل پا گئی ہے جس نے "سیدنا" کی اس امتیازی "شان کبریائی" کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ اور جس پر "حضور سیدنا" اپنی قہر و جلال کی تلوار کا آخری وار بھی صرف فرما چکے ہیں۔ یعنی اس قسم کے تمام "گستاخ و بے ادب" افراد کو ذات سے باہر کر دیا گیا ہے اور اب وہ "سیدنا" کے "مخلصین" کے یہاں نہ تو شادی کر سکتے ہیں، نہ اُن کی کسی تقریب میں بلائے جا سکتے ہیں اور نہ کوئی اور "صحیح العقیدہ" بوہرہ اُن کی کسی تقریب میں شریک ہو سکتا ہے۔

الغرض یہ ہے وہ عالم جو الوہی خلافت کے عقیدہ سے پیدا

ہوتا ہے۔ اب اگر یہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام میں اسی کا حکم ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یا تو ہر معقول و سنجیدہ انسان اس فیصلہ کی صداقت و حقانیت سے انکار کر دے اور یا پھر اسلام کو غیر الہامی یا کم از کم ناقابل عمل مذاہب کی صف میں رکھ کر ہمیشہ کے لئے اُسے الوداع کہہ دے۔

میں یہاں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس بحث میں میں نے اپنا سارا زور استدلال عقل عمومی کے فیصلہ پر موقوف کیا ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے یقین ہے کہ اس ضمن میں میں نے جن بدیہی اور روشن حقیقتوں کو پیش کیا ہے اُن میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہو سکتی یعنی کوئی معقول اور سنجیدہ انسان عقل عمومی کے اعتبار سے اس امر میں مجھ سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ اہل تشیع الوہی امامت کے عقیدہ کو جس نوع سے مانتے ہیں وہ نہ تو صرف انسانیت کے عام نقطۂ نظر سے ناقابل قبول ہے بلکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو انسان کے قوائے فکر و عمل کی صحیح نشو و نما ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ کردار و گفتار کی آزادی ابد الآباد تک کے لئے معدوم ہو جائے۔ انسانوں کے مابین امتیاز و تفریق کی ابدی خلیج حائل

ہو جائیں، ذہنی استعداد اور معاشرتی تفوق و برتری کی وہ مکروہ فضا پیدا ہو جائے جو انسانیت کو رفتہ رفتہ ہندؤں جیسی ذات پات کے تصور سے قریب تر کر دے، انسانی عقل و فکر پر پہرے بیٹھ جائیں۔ اور دنیا کے بسنے والے خدائے واحد کے علاوہ بہت سے ایسے بتوں کی پرستش کرنے لگیں جن کو پاش پاش کرنے کی کوشش آج دنیا کے ہر گوشہ میں کی جا رہی ہے ۔ جو انسانیت کے نشوونما کے راستہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہیں اور جن پر محمد عربی نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ موثر اور تباہ کن ضرب لگائی تھی ۔

ممکن ہے میری اس گزارش کو مذہبی تعصب و جانبداری پر مبنی قرار دیا جائے ۔ لیکن میں ایمان و ضمیر کی پوری صداقت و پاکبازی کے ساتھ رب جلیل کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ان نتائج تک پہونچنے میں فرقہ وارانہ عصبیت و تنگ نظری سے کنارہ کش ہو کر غور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کے نتیجہ کے طور پر میں نے جس چیز کو صحیح سمجھا ہے اسی کو اوپر کی سطور میں عرض کیا گیا ہے حتی کہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا تب بھی غور کرنے کے بعد میرا عقیدہ

یہی ہوتا جو پیش کیا گیا ــــــ لیکن چونکہ اتفاق سے میں اہل التسنن کے خاندان میں پیدا ہوگیا ہوں اس لئے یقیناً شیعہ حضرات مجھ پر فرقہ وارانہ جنبہ داری اور مذہبی عصبیت کا الزام عائد کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔ اور اس لئے میں اُن کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس امر کے فیصلہ کے لئے دنیا کی کسی غیر جانبدار شخصیت کو بطور حکم مقرر کرلیں حتّٰی کہ مجھے اس میں بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر وہ مسولینی اور ہٹلر کو ــــ جن کے آمرانہ اصول کو وہ اپنے دعوے کے اثبات میں اکثر پیش کیا کرتے ہیں ــــــ اس فیصلہ کے لئے ثالث بنالیں۔ پس اگر وہ یہ فیصلہ کریں کہ اہل تشیع کا "عقیدۂ امامت" انسان کی عقل عمومی کے منافی نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس کو ماننے کے بعد انسانی معاشرت اور انسانی ذہن و فکر کی طاقتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچنا یقینی نہیں ہے ــــــ تو سب سے پہلا شخص جو علانیہ شیعیت کو قبول کرکے آل رسول کی شہادت پر سینہ کوبی کرتا ہوا "الوصی خلافت و امامت" کے عقیدہ کا جھنڈا ہاتھ میں لیکر میدان میں نکلے گا وہ یہ خاکسار ہوگا۔

خلافت کا مسئلہ آیات و احادیث کی روشنی میں

عقلی نقطہ نظر سے اس مختصر سی گذارش کے بعد اب میں اُن آیات و

احادیث پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو "الوہی خلافت" کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ بحث کا کوئی شعبہ تشنہ نہ رہے۔ اور اس کا ہر پہلو پوری پوری طرح روشنی میں آجائے۔

اس حقیقت سے شیعہ حضرات کو بھی اتفاق ہے کہ قرآن نے حضرت علی کی جانشینی کا کہیں صراحۃً تذکرہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۷ء کے "نگار" میں کسی فاضل اہل قلم نے شیعہ حضرات کی نمایندگی کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن نے "اپنے مقاصد کو ایک طرح کے ابہام کے پردہ میں رکھا ہے لیکن قرائن ایسے قائم کئے ہیں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہونچ سکتا ہے"

پھر اسی مضمون میں یہی حضرت ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ:۔

"بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ قرآن میں بالتصریح نام تھے اور وہ حذف کر دیے گئے ہیں، مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں"۔

گویا اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ الوہی خلافت کے مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے۔

۱۔ اُن قرائن سے نتائج اخذ کرنا چاہئیں جو قرآنی آیات سے مستنبط ہوتے ہیں۔

۲۔ احادیث نبوی کو دیکھنا چاہئے۔

۳۔ صحابہ اور تابعین کی اُن تصریحات کو دیکھنا چاہئے جو آیات و احادیث کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً انھوں نے بیان کیں۔

آیات

وہ قرآنی آیات جن کی بناء پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُن سے حضرت علی کی الوہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ لیس البرّ بان تأتوا البیوت من ظهورها ولکنّ البرّ من اتّقیٰ وأتوا البیوت من ابوابها (سورۂ بقرہ رکوع ۲۴)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو"

۲۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (سورۂ مائدہ رکوع ۱)

"آج میں نے تمھارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کر دیا اور میں نے پسند کیا کہ تمھارا دین اسلام ہو"

۳۔ انذر عشیرتك الاقربین واخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنین۔ (سورۂ شعراء رکوع ۱۱)

"اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں اُن کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی اُن کے ساتھ نرمی سے پیش آ)"

۴۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔ (سورہ مائدہ رکوع ۸)

"تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اُس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور عجز و انکساری سے زندگی گذارتے ہیں"۔

۵۔ یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ (سورہ مائدہ رکوع ۱۰)

"اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہونچایا اُس کا پیغام۔ اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کریگا"۔

ان آیات کو دیکھنے سے آپ کو پتہ چلا ہوگا کہ بظاہر ان سے کسی طرح بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ ان کی غایت نزول حضرت علی کی الوہی خلافت کو ثابت کرنا تھا۔ اس کے برخلاف ان میں چند ایسے عمومی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو بجائے خود مکمل ہیں اور جن کی توضیح و تشریح کے لئے کسی

مقدمہ یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان آیات سے حضرت علی کی امامت کا حکم مستنبط کرنے کے لئے شیعوں کی جانب سے چند احادیث نبوی کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی خاطر میں ہر ایک آیت کے شیعی استدلال کو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

آیت اوّل } رسول کریم نے فرمایا ہے: انا مدینۃ العلم و علی بابھا فمن اراد العلم فلیأت الباب (یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اُس شہر کا دروازہ ہے پس جو شخص علم حاصل کرنا چاہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ اس دروازہ سے داخل ہو)

شیعہ حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا آیت کو رسول کے اس قول کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس کا صراحۃً یہ منشا ہوگا کہ قرآن اس بات کا مؤید ہے کہ رسول کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ صرف حضرت علی ہیں۔

لیکن اس استدلال پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نکتہ سنج نظریں خود اس بات کو معلوم کر سکتی ہیں کہ یہ تاویل کس حد تک قرین عقل ہے جبکہ خود شیعہ مفسرین بھی اس کے مدعی نہیں ہیں کہ آیت زیر بحث کے نازل ہونے کے فوراً بعد حضور اکرم نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہو۔ اور اس لئے اب

استدلال کی منطق صرف یہ رہ جاتی ہے کہ "رسول کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے کیا رسول کے پروپیگنڈے کو قوت نہیں پہونچائی؟"

اگر اس وقت اس بات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ اس طرح غیر واضح انداز سے اپنے مقصد کا اشارۃً پروپیگنڈا کرنے سے رسول کریم کی ذات پر موجودہ زمانہ کی ڈپلومیسی اور شاطرانہ چال کا الزام عائد ہوتا ہے تب بھی اس سے اصل مقصد ثابت نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اگر سعی و کوشش کے بعد اپنے شیعہ دوست کی خاطر سے کچھ روادارانہ انداز بھی اختیار کیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہ "ظن" قائم کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس آیت سے قرآن کریم نے حضرت علی کی برتری مراد لی ہو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ "انّ الظّن لا یغنی من الحق شیئاً"۔

آیت دوم یہ آیت بھی امامت و خلافت سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ لیکن اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نبی کریم کی اس تقریر کے بعد نازل ہوئی ہے جو آپ نے غدیر خم "جہاں کی تھی اور جس میں حضرت علی کو "مولی المومنین" کہا تھا۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"خدا میرا مولیٰ ہے۔ اور میں تمام مومنین کا مولیٰ ہوں۔ اور اس کے بعد جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علی بھی مولیٰ ہے"

جس کے متعلق جناب نیاز نے اپنے محاکمہ میں یہ لکھا ہے کہ شیعوں کے

پاس جناب امیر کی ولایت کی یہ سب بڑی شہادت ہے۔"

لیکن مذکورۂ بالا نص قرآنی میں نہ تو مولیٰ کا لفظ مذکور ہے اور نہ خلافت و امامت کے متعلق کوئی بعید ترین اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور اس لئے دلیل کی ساری بنیاد اصل آیت کے بجائے صرف مذکورۂ بالا حدیث قرار پاتی ہے۔ مگر قرآن کی زیر بحث آیت کے مفہوم میں کوئی ایسا خلا یا نقص نہیں ہے جس کے پیش نظر اسے کسی دوسری بات سے متعلق کرنا یا کسی حدیث کے ساتھ اسے ضم کرنا قرین عقل قرار دیا جائے۔ اس کے برعکس آیت کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ ایک سیدھی سادھی صداقت کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے شیعہ سنی اختلاف، سے ہٹ کر غور کیجئے کہ رسول کریم اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرماتے ہیں کہ "آج تم پر خدا نے اپنی تمام نعمتیں مکمل کر دیں"۔ اور اس طرح قرآن کے احکام و ہدایات کو ابدالآباد تک کے لئے اہل عالم کے واسطے شمع راہ بنانے کی اپیل کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کون سا ایسا خلا یا نقص ہے جس کو پورا کرنے کے لئے "غدیر خم" کی حدیث کے ساتھ اس کا دامن باندھنا ضروری ہو۔

آیت سوم } مجھے شیعہ حضرات کی اس بیکسی پر رحم آتا ہے جس کے ماتحت وہ ڈوبتے آدمی کی طرح ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔ میں نے پورے سکون قلب کے ساتھ قطعاً غیر جذباتی

اندازے کئی گھنٹے مسلسل اس امر پر غور کیا کہ آیا واقعۃً اس آیت کو خلافت علیؑ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے کوئی تاویل ایسی نہ مل سکی جسے بہر نوع اطمینان بخش کہا جا سکے۔

شیعہ حضرات اس آیت کو بعیت عشیرہ کے واقعہ سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ اگر اس آیت کو بعیت مذکور سے علٰحدہ کر لیا جائے تو اس سے اُن کے مقصود پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مگر اس کے لئے وہ یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ "تمام مذہبی شعبوں میں وحی متلو" یعنی قرآن کی ہدایتیں مجمل حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل رسول کے عمل سے ہوئی ہے۔"

اگرچہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دینے میں استاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقہ نے کھولا[1] ہے۔ مگر پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تخیل کی کون سی پرواز سے اس آیت کو مجمل کی صف میں رکھا جا سکتا ہے جبکہ یہ بذات خود بالکل مکمل اور اپنے مفہوم و معنی کے اعتبار سے بہر نوع غیر ناقص و کامل ہے۔ پھر اس کا فیصلہ مجھ سے نہیں۔ روئے زمین کے کسی صاحب الرای دیگر غیر شیعہ انسان سے حاصل کر لیجئے۔ یورپ و امریکہ کے مستشرقین سے

---

[1] ملاحظہ ہو لٹریری ہسٹری آف عربس۔ مصنفہ پروفیسر نکلسن

پوچھئے۔ چین و جاپان کے کسی بالکل غیر متعلق آدمی سے دریافت کیجئے
فلپائن اور اسٹریلیا کے کسی ناواقف حالات انسان سے معلوم کیجئے
اور اگر کسی ایک جگہ سے بھی یہ آواز اٹھے کہ یہ آیت کسی نوع سے بھی کسی
واقعۂ خاص سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اور بجائے خود کسی مضبوط و
مکمل صداقت کی حامل نہیں ہے تو میں سپر ڈالنے کے لئے طیار ہوں۔

بہر حال یہ قرآنی آیت ہماری بحث سے خارج ہو جاتی ہے۔ رہ گئی بعیت عشرۂ والی حدیث۔ سو اس پر میں "احادیث" کے ذیل میں اپنی رائے عرض کرونگا۔

آیت چہارم } اس آیت میں بھی کوئی ایسا ابہام و خلا نہیں ہے جس سے حضرت علی کی خلافت پر استدلال قائم کیا جائے۔ اور تصور و تخیل کی کسی بعید ترین پرواز سے بھی اسے خلافت و امامت کے مسئلہ کے ساتھ متعلق کیا جائے لیکن شیعہ حضرات حسب عادت اس آیت کے "فحوائے منصوص" سے نہیں بلکہ اس کے "شان نزول" سے استدلال کرتے ہیں۔ اور اس لئے قرآن کے بجائے شان نزول والی حدیث معرض بحث میں آجاتی ہے۔ پس اگر شان نزول کی بیشمار روایات کے باہمی تضاد و تخالف کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی اس استدلال کا تعلق قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے رہ جاتا ہے۔

آیت پنجم

اس آیت کے متعلق شیعہ حضرات کے فاضل نمایندہ کا یہ بیان ہے کہ :-

"یہی پُرزور حکم محکم ہے جس سے حضرتِ علی کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے"۔

لیکن یہاں بھی استدلال کا سارا زور اصل آیت کے بجائے صرف شانِ نزول سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اہلِ سنت کی تصانیف سے بہت سی روایات کو نقل کر کے یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایت علی کی تبلیغ کے بارہ میں نازل ہوئی ہے"۔

لیکن اس آیت کے الفاظ سے جو مفہوم خود ہوتا ہے وہ اپنی جگہ اتنا مکمل ہے کہ اس کی توضیح و تفصیل کے لئے شانِ نزول کی کسی حدیث کو سامنے رکھنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ تنہا اس آیت سے حضرت علی کی الٰہی خلافت کا حکم ہرگز مستفاد نہیں ہوتا۔ ہاں اگر شانِ نزول کو صحیح مان لیا جائے تب البتہ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے۔ اور اس سے یہاں بھی قرآن پر بحث کرنے کے بجائے صرف حدیث معرضِ گفتگو میں آجاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں اشارۃً یا صراحۃً کسی طرح حضرت علی کی امامت کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے مختلف

احادیث و واقعات کو کھینچ تان کر قرآنی آیات سے متعلق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس قسم کی تمام کوششیں اتنی سفسطہ آمیز اور غیر تسلی بخش ہیں کہ عام انسانی دماغ اُن کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور گو تعصب و تنگ نظری کے ماحول میں ذاتی اغراض و مفاد کے دائرہ میں وہ کتنی ہی دل خوش کن نظر آئیں لیکن علم و تحقیق کی روشنی میں وہ بے حقیقت سی ہو جاتی ہیں۔ اور اس اہم اور بنیادی مسئلہ میں قرآن کی خاموشی شیعہ حضرات کے مشن کے لئے شدید طور پر نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ اسی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے شیعوں کے متعدد مجتہدین یہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ قرآن سے وہ آیات و احادیث حذف کر دی گئی ہیں جن میں حضرت علی کی امامت کے مسئلہ کو ناقابل انکار طور پر بیان کیا گیا ہے۔ غالباً اہل تشیع عام طور پر تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اُن کے قابل احترام مجتہدین کی وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں قرآن کی بہت سی آیات کو بزعم خود صحیح کر کے نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ حیات القلوب وغیرہ کے صفحات اس امر کی کھلی ہوئی شہادت کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ جمہور شیعہ در حقیقت تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں لیکن جب اُن کو اپنے مخصوص عقائد کی تائید

میں ایک آیت بھی "بین الدفتین" دستیاب نہیں ہوئی تو انھیں فوراً
اپنے عقائد پر شک وشبہہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اسی تشویش
کو دور کرنے کے لئے بعض شیعی مجتہدین نے قرآن کی تحریف کا دعویٰ کیا ہے اور
اپنے متشکک مریدوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنیوں نے
قرآن سے وہ آیات حذف کر دی ہیں جن میں آل بیت اور امامت کے
متعلق بالتصریح احکام مذکور تھے۔

چنانچہ میں نے اپنے ایک مخلص شیعہ دوست کے سامنے جب شیعہ حضرات کے
"عقیدہ تحریف قرآن" کا تذکرہ کیا تو انھیں یہ سن کر تعجب ہوا اور
گو وہ نہایت فاضل نوجوان تھے لیکن مجتہد بھی نہ تھے۔ یہ قول ان کے لئے
ایک حیرت انگیز انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کے
ماننے سے اس وقت تک انکار کرتے رہے جب تک کہ میں نے خدا بخش
لائبریری (پٹنہ) کے تحریف شدہ قلمی نسخہ اور حیات القلوب وغیرہ کا مطالعہ
ان کو نہ کرا دیا۔

وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے
فرمایا: "یہ کتابیں ہمارے یہاں معتبر نہیں ہیں۔ اور ——— کم از کم
میں ——— کسی ایسے قرآن پر ایمان رکھنا کفر سمجھتا ہوں جو قرآن
کے موجودہ "بین الدفتین" نسخہ سے ایک حرف اور ایک نقطہ کا بھی اختلاف رکھتا ہو

احادیث

مذکورۂ بالا بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عقل سلیم اور قرآن دونوں اعتبار سے خلافت و امامت کا مسئلہ شیعہ حضرات کے حق میں فیصلہ نہیں ہوتا۔ عقل سلیم کا فیصلہ تو کھلے طور پر شیعہ حضرات کے مخالف ہے۔ جیسا کہ اس مقالہ کے ابتدائی صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں اس مسئلہ کا کہیں تذکرہ نہیں حتیٰ کہ بعید ترین تاویلات کے بعد بھی شیعہ حضرات اپنے مفید مطلب قرآن سے کوئی حکم مستنبط کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ البتہ احادیث کے میدان میں جنگ اور مبارزطلبی کی کافی گنجائش ہے بلکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے اس قضیہ کو قضیہ بنا دیا ہے ورنہ عمر بن عبدالعزیز یا زیادہ سے زیادہ بنی امیہ کی خلافت کے سقوط کے بعد سے یہ اختلاف ہمیشہ کے لئے دماغوں سے محو ہو چکا ہوتا۔

لیکن میں اس وقت احادیث کی صحت و عدم صحت پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا اور نہ اس بحث میں پڑنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کون کون سی احادیث صحیح ہیں یا صحیح ہو سکتی ہیں۔ اور کون کون سی غلط۔ اس لئے کہ اول تو اس طرح یہ بحث اتنی طویل ہو جائیگی کہ

اس کا مطالعہ ہر شخص پر بار ہو جائے گا اور دوسرے نتیجہ کے اعتبار سے بھی بالکل غیر مفید رہیگی۔ اس لئے کہ احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود بھی کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو قریب ناممکن ضرور ہے اور اس سلئے میں کسی حدیث کی صحت و عدم صحت کے متعلق کوئی رائے دیکر کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ لیکن اس سلسلہ میں کم از کم اتنا ضرور عرض کر دونگا کہ چونکہ احادیث کے اعتبار سے دونوں فریقوں کے پاس برابر کا "بوجھ" ہے اس لئے اس استدلال کو بحث سے خارج کر دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہت سی باہم متضاد و مخالف احادیث کے ہجوم میں ایک غیر جانبدار منصف کا فیصلہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف اُن احادیث کو قابل غور سمجھا جائے جو عقل سلیم پر پوری اتریں یا جنھیں مسلمانان عالم کی اکثریت صحیح تسلیم کرتی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہر دو اعتبارات سے شیعہ حضرات کو مایوسی ہوگی اور اس لئے میں غالباً شیعہ حضرات کے ساتھ بے انصافی کرونگا۔ اگر اس میدان میں انھیں دعوت مقابلہ دوں۔

لیکن شاید کہیں شیعہ حضرات میرے اس طریق عمل کو قابل اعتراض نہ قرار دیں۔ اور جس طرح ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت

سمجھتا ہے! اسی طرح وہ بھی اسی ایک نقطہ پہ میری کل عرضداشت کو
ناقابل قبول قرار دیدیں۔ اس لئے میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز
کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ان تمام احادیث پر جو اس سلسلہ میں پیش
کی گئی ہیں یا پیش کی جا سکتی ہیں فرداً فرداً بحث کرنا غیر ضروری سمجھتا
ہوں۔ اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اگر میں شیعہ حضرات کی مستند
احادیث کی مدد سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں
تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤنگا۔
اور اس لئے میں بالکل غیر مناظرانہ طور پر یہاں اُن احادیث کو نقل
کردینا مناسب سمجھتا ہوں جو شیعہ حضرات کے لئے ہر حیثیت سے قابل
قبول ہیں اور جن کے اعتبار سے خلافت و امامت کے مسئلہ میں میرے
نقطۂ نظر کی کامل تائید ہوتی ہے۔

خلفائے راشدین

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حضرت علی نے خلفائے ثلٰثہ کی خلافت
کو کبھی بھی اسلام کے منافی قرار نہیں دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان حضرات کو
ہمیشہ نہایت مقدس و قابل احترام سمجھا اور ہمیشہ اُن کے ساتھ
تعاون و اشتراک عمل کرتے رہے۔ وہ ظاہر ہے کہ اگر خلفائے ثلٰثہ

کا زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت ہوتا تو حضرت علی جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں ہرگز بسر نہ کرتا اور پوری طاقت کے ساتھ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرکے خدا اور رسول کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلان کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسندِ خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسین کی طرح میدان کارزار میں خاک و خون میں تڑپتے نظر آتے ہمارے شیعی نمایندہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:۔

(خلفائے ثلٰثہ کی خلافت کے) دور میں اصل خلافت اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکم خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدود علمی کے اندر (؟) بہت حد تک ظواہر اسلامی محفوظ رکھے جاتے تھے اور پابندی شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یعنی شریعت اسلام اور احکام خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا۔ محرمات و کبائر کی تلقین نہیں تھی بلکہ ان کے اوپر حدود کا اجرا کیا جاتا تھا۔ اور بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقت اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہونچا ہو لیکن بہرحال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی

سمجھتا ہے! اسی طرح وہ بھی اسی ایک نقطہ پر میری کل عرضداشت کو ناقابل بدل قرار نہ دیدیں۔ اس لئے میں اس پہلو کو بالکل نظرانداز کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ان تمام احادیث پر جو اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں یا پیش کی جاسکتی ہیں فرداً فرداً بحث کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اگر میں شیعہ حضرات کی مستند احادیث کی مدد سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہوجاؤنگا۔ اور اس لئے میں بالکل غیر مناظرانہ طور پر یہاں اُن احادیث کو نقل کردینا مناسب سمجھتا ہوں جو شیعہ حضرات کے لئے ہر حیثیت سے قابل قبول ہیں اور جن کے اعتبار سے خلافت و امامت کے مسئلہ میں میرے نقطۂ نظر کی کامل تائید ہوتی ہے۔

خلفائے راشدین

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حضرت علی نے خلفائے ثلثہ کی خلافت کو کبھی بھی اسلام کے منافی قرار نہیں دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان حضرات کو ہمیشہ نہایت مقدس و قابل احترام سمجھا اور ہمیشہ اُن کے ساتھ تعاون و اشتراک عمل کرتے رہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر خلفائے ثلثہ

کا زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت ہوتا تو حضرت علی جیسا جلیل القدر
مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں
ہرگز بسر نہ کرتا اور پوری طاقت کے ساتھ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرکے
خدا و رسول کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ جس کے بعد یا تو
وہ اعلان کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسند خلافت پر متمکن ہو جاتے
اور یا حسین کی طرح میدان کارزار میں خاک و خون میں تڑپتے نظر
آتے ہمارے شیعی نمایندہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:-

(خلفائے ثلثہ کی خلافت کے) دور میں اصل خلافت اسلامی کے
معاملہ میں کتنا ہی حکم خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے
معاملات میں اپنے حدود علمی کے اندر (؟) بہت حد تک ظواہر اسلامی
محفوظ رکھے جاتے تھے اور پابندی شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یعنی
شریعت اسلام اور احکام خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا
اعلان نہیں تھا۔ محرمات و کبائر کی تلقین نہیں تھی بلکہ ان کے اوپر
حدود کا اجرا کیا جاتا تھا۔ اور بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اس سے
اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقت اسلام کو کتنا ہی
صدمہ پہونچا ہو لیکن بہرحال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی
اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی

عمر ختم ہی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے علی ایسے محافظ اسلام نے تلوار نیام میں رکھی اور پچیس برس کی طویل مدت تک اپنے حقوق کی پامالی (۱) اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گذار دی ۔ اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہ کی"۔ (نگار جنوری ۳۶ء صفحہ ۸۹)

اس کے جواب میں میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا صرف ذیل میں اُن کتابوں سے جن کو اہلِ تشیع قابلِ استناد دلائل استشہاد مانتے ہیں چند ایسی روایات نقل کئے دیتا ہوں جن سے ظاہر ہوگا کہ حضرت علی کی نظر میں ابوبکر و عمر کی خلافت نیز اُن کے عہد خلافت کی کیا وقعت تھی ۔ مجھے اگر یہ روایتیں بخاری سے نقل کی جاتیں تو یہ شبہہ ہمارے شیعہ بھائی ان پر یہی اُڑا سکتے تھے لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں خود شیعوں کی قابل اعتنا کتابوں سے یہ حوالے پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں ۔

ا جس زمانہ میں حضرت علی اور امیر معاویہ کے مابین خلافت کا تصفیہ چل رہا تھا ۔ اُس وقت جناب علی نے امیر معاویہ کو ایک طویل خط بھیجا تھا جس کا مفہوم[1] یہ تھا کہ :-

"اے معاویہ الخیہ نوشتہ بودی کہ فاضل تر اصحاب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق و بعد آن عمر فاروق بودند بجان دسرمن کہ نصیب شان

---

[1] کتاب الفتوح ابن عاصم کوفی شیعہ صفحہ ۸۷ ۔ شرح نہج البلاغت مطبوعہ طہران ۔

بزرگی بوده است:۔

آگے چل کر اسی خط میں آپ لکھتے ہیں کہ: "اُن دونوں کی وفات نے مجھکو اور تمام مسلمانوں کو عظیم صدمہ پہونچایا ہے۔ خداوند تعالیٰ ان پر رحمت کرے۔ اُنھوں نے دین کے استحکام کے لئے بہت سی نیک باتیں کیں اور اسلام کو بہت سی بدعتوں سے پاک کردیا۔ خدا اُنھیں جزائے خیر دے لیکن اے معاویہ تجھ کو اُن بزرگوں سے کیا نسبت؟ وہ ہمارا صدیق تھا اور ہم ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ تجھے اُس سے کیا سروکار؟ اسی طرح عمر فاروق ہمارا فاروق تھا جو حق کو باطل سے جدا کرتا تھا۔ وہ ہمارے دوستوں کا دوست اور ہمارے دشمنوں کا دشمن تھا۔"

۲۔ سوید بن غفلہ ایک صحابی تھے۔ آپنے ایک روز حضرت علی سے کہا کہ "اے علی آج میں نے ایک ایسا مجمع دیکھا جو ابوبکر و عمر کی حقارت کرتے تھے۔ اور عبداللہ ابن سبا اُن کا سرغنہ تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر اُن کو بدکلامی سے روکا لیکن اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم حضرت علی کی مرضی کے بموجب ایسا کرتے ہیں۔"

صحابی مذکور فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت علی بہت غضبناک ہوئے اور اسی روز آپنے ایک خطبہ دیا جس میں رو رو کر یہ فرمایا کہ:۔

"میں اُس قوم کو عذاب کرونگا! جو وہ ہیں کون؟ بیزار ہوں میں

اُس قوم سے جو رسول کے دو بھائیوں، رسول کے دو وزیروں اور مسلمانوں کے دو باپوں کی یوں توہین کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کا دوست اونچے پایہ کا مومن اور اُن کا دشمن فاسق و بے دین ہے۔

۳۔ قمی شیعہ نے اپنی تفسیر قرآن میں سورۂ توبہ کی مشہور آیت "ثانی اثنین اذ ھما فی الغار" کے ذیل میں اپنے باپ کی سند سے بحوالہ امام جعفر صادقؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ قال لما کان رسول اللہ فی الغار قال لابی بکر کانی انظر الی سفینۃ جعفر و اصحابہ تقوم فی البحر و انظر الی الانصار فقال ابو بکر و تراھم یا رسول اللہ؟ قال نعم قال فارنیھم فمسح علی عینیہ فراھم فقال یا رسول اللہ انت الصدیق۔

"مروی ہے کہ جب نبی کریم غار میں تھے تو آپ نے حضرت ابو بکر سے فرمایا کہ مجھے ایسا نظر آتا ہے گویا کہ میں جعفر اور اس کے رفقاء کی کشتی کو سمندر میں کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اور انصار کو بھی دیکھ رہا ہوں۔" اس پر حضرت ابو بکر نے دریافت کیا کہ "اے رسول خدا کیا آپ سچ مچ انھیں دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا "ہاں" پھر حضرت ابو بکر نے کہا کہ "تو مجھے بھی دکھا دیجئے۔" یہ سُن کر آپ نے اُن کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اُن کو بھی دکھلا دیا۔ یہ دیکھکر حضرت ابو بکر نے کہا آپ صدیق (سچے) ہیں۔

؎ تواق الحکایت از یحییٰ ابن حمزہ شیعہ زیدی ۱۲

۴۔ سورۂ نور کی ایک آیت ہے: "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون"
(یعنی خدا اس زمین کا وارث اپنے نیک بندوں کو بناتا ہے) اس
کی تفسیر میں خلاصۃ المنہج کے شیعہ مجتہد صاحب فرماتے ہیں:۔
"در اندک زمانہ حق تعالیٰ وعدۂ مومناں را وفا نمودہ جزیرۂ عرب و
دیار کسریٰ و بلاد روم بدیشاں ارزانی نمودہ"
اس توضیح کی ضرورت نہیں کہ جزیرۂ عرب و دیار کسریٰ اور بلاد
روم خلفائے ثلٰثہ ہی کے عہد میں مفتوح ہوئے ہیں۔
۵۔ شیعوں کی کتاب "کشف الغمہ" میں یہ روایت مذکور ہے کہ "جو ابوبکر
کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے"۔
۶۔ جس وقت حضرت صدیق اکبر نے وفات پائی تو حضرت علی زار
قطار روتے ہوئے خلیفۂ اول کے جنازہ پر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ
آج کے دن نبوت کی خلافت منقطع ہو گئی۔ اور فرمایا احسنت
الخلافۃ حین ارتد الناس۔
۷۔ فصول امامیہ میں ہے
عن ابی جعفر محمد بن علی الباقر علیہ السلام انہ قال لجماعۃ
خاضوا فی ابی بکر و عمر و عثمان اما تخبرونی انھم من المھاجرین
الذین اخرجوا من دیارھم و اموالھم یبتغون فضلا من اللہ

ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ؟ قالوا لا فانتم من الذین تبوءوا الدار والایمان قبلھم یحبون من ھاجر الیھم؟ قالوا لا قال " اما قد برئتم ان تکونوا احد ا ھذین الفریقین و انا اشھد انکم لستم من قال اللہ تعالی فیھم والذین جاؤا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولا اخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم؟

" ابو جعفر محمد بن علی باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے ابوبکرؓ عمر اور عثمان کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے ۔ آپ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مجھے بتلاؤ گے کہ یہ لوگ (یعنی ابوبکرؓ و عمر اور عثمان) اُن مہاجرین میں سے تھے جن کے متعلق خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ " الذین اخرجوا من دیارھم .....الخ " (یعنی وہ لوگ جو محض اس لئے بے خانماں کئے گئے کہ وہ خدا کی خوشنودی کے طلبگار رہتے اور اللہ اور اُس کے رسول کی مدد کرتے تھے) اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا " نہیں " پھر آپ نے دریافت کیا کہ "تو کیا پھر یہ لوگ (ابوبکرؓ عمر و عثمان) اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ " من الذین تبوءوا الدار والایمان الخ (یعنی وہ جنھوں نے اپنا سب کچھ مہاجرین

کے لئے وقف کردیا) اس کا جواب بھی ان لوگوں نے نفی میں دیا۔ یہ سن کر آپ نے کہا" بیشک تم خود بھی مذکورہ بالا دونوں گروہوں (یعنی مہاجرین وانصار) میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہو۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ تم اُن لوگوں میں سے بھی نہیں ہو جو مہاجرین وانصار کے بعد آئیں گے۔ اور جو اپنے لئے اور اپنے اُن بھائیوں کے لئے جو ان سی پہلے گذر چکے دعائے مغفرت کریں گے اور یہ کہیں گے کہ" اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے بغض وعناد پیدا نہ کر اے اللہ تو مہربان رحمت والا ہے"۔

۸۔ نہج البلاغت میں حضرت علی کا ایک خطبہ درج ہے۔ یہ خطبہ اس وقت دیا گیا تھا جبکہ حضرت عمر جہاد روم پر جانے کا قصد فرما رہے تھے۔ اس خطبہ میں جناب امیر نے حضرت عمر کو مسلمانوں کا ملجا و ماوا ظاہر فرمایا ہے۔ اور یہ مشورہ دیا ہے کہ تم بذات خاص جہاد پر نہ جاؤ۔ تم عرب کی جان ہو اس لئے تمھاری جان کو نقصان پہونچنا کل اہل عرب کو نقصان پہونچنے کے مترادف ہے۔

یہ خطبہ بہت طویل ہے اور نہج البلاغت میں تمام وکمال درج ہے۔

۹۔ جلاء العیون کے باب وصایا میں حضرت علی کی یہ وصیت درج ہے۔

"اصحاب رسول کی رعایت کرو۔ اُنھوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے کی راہ دی [۱]

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ خلفائے ثلثہ کو کسی نے "صحابہ" کی صف سے خارج نہیں کیا ہے

الوہی خلافت

صفحات ماقبل میں یہ امر بخوبی واضح کردیا گیا ہے کہ حضرت علی کی خلافت کے متعلق قرآن مجید بالکل ساکت ہے اور اس میں کوئی نص قطعی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس خلافت پر استدلال کیا جاسکے۔ شیعہ حضرات کے نمایندہ نے اس سلسلہ میں جتنی آیات کو کھینچ تان کر اس واقعہ سے متعلق کرنے کی کوشش کی تھی اُن سب پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جاچکی ہے۔ لیکن اس پر ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر قرآن مجید میں جناب امیر کی خلافت کے بارے میں نصوص قطعیہ موجود ہوتیں تو بعض شیعہ اہل علم کو قرآن میں تحریف کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ

[۱] جلاء العیون، جلد اول صفحہ (۲۰۸)

بہت سے شیعہ مجتہدین کی جانب سے قرآن میں تحریف کی گئی ہے۔ اور تحریف شدہ عبارتوں میں صرف جناب امیر کی خلافت و وصایت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ اگر قرآن اس بارے میں ساکت نہ ہوتا تو یہ غریب اتنے بڑے اقدام کی زحمت کیوں گوارا کرتے۔

چنانچہ ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب حیات القلوب کی جلد سوم میں خوب جی بھر کر قرآنی آیات میں حک و اضافہ کیا ہے۔ ولایت علی کے ثبوت کے لئے حسب دلخواہ مناسب الفاظ بڑھادئے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ "در حدیث وارد شدہ کہ ثلث قرآن در فضائل اہلبیت و ثلثے در مثالب دشمنان ایشاں است" لہ

اسی طرح اس مصنف نے اپنی ایک دوسری کتاب "تذکرۃ الائمہ" میں بھی آیات کو تحریف کیا ہے۔

علی ہذا القیاس شیعوں کی کتاب حدیث "کلینی" میں قرآن کی سترہ ہزار آیات بیان کی گئی ہیں۔ حالانکہ موجودہ قرآن میں صرف چھ ہزار آیات ہیں۔

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں بھی ایک تحریف شدہ قرآن مجید موجود ہے

لہ حیات القلوب حصہ سوم صفحہ (۴)

جس میں چند آیات کے اضافہ کے علاوہ ولایت و وصایت پر مستقل دو سورتیں بڑھائی گئی ہیں۔

یہاں میں اس بات کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے غالباً جمہور شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں اور اس لئے میرے مذکورہ بالا بیان سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں عام شیعہ حضرات کو تحریف قرآن کا قائل ثابت کروں۔ بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں خلافت علی کے متعلق نصوص قطعیہ موجود نہیں ہیں۔ اور اسی بنا پر بعض شیعہ مجتہدین کو اپنے اس عقیدہ کے ثبوت کے لئے قرآن مجید میں تحریف کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آیا۔

حضرت علی کی الوہی خلافت کے ثبوت میں بہت سی احادیث پیش کی جاتی ہیں جن میں غدیر خم کی حدیث کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن میں ان احادیث پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے برخلاف میں تو شیعہ حضرات کی مستند کتابوں سے صرف یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ الوہی خلافت کا اعتقاد غلط ہے ـــــ یعنی خدا یا رسول خدا کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ رسول کریم کے بعد حضرت علی ہی خلیفہ بنائے جاتے۔

۱۔ اہل تشیع کے مشہور مجتہد بحرانی نے شرح نہج البلاغت (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:۔

ایک رات رسول کریم اپنی زوجہ حضرت حفصہ کے حجرہ میں تشریف رکھتے تھے مگر اتفاق سے حضرت حفصہ اس وقت موجود نہ تھیں۔ اور اس لئے آپ نے یہ رات اپنی دوسری زوجہ ماریہ قبطیہ کے حجرہ میں بسر فرمائی صبح حضرت حفصہ کو اپنی حق تلفی کی شکایت ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "اے حفصہ تم ناخوش نہ ہو" ہم تم کو دو خوشخبریاں سناتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماریہ قبطیہ کو ہم نے اپنے اوپر حرام کیا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے بعد ہمارا خلیفہ ابوبکر ہوگا۔ اور اس کے بعد تمہارا باپ عمر۔ لیکن دیکھو یہ راز ہے۔ اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ ورنہ خداتعالیٰ ہم پر ناراض ہوگا۔" اس پر حفصہ نے دریافت کیا کہ آپ کو یہ خبر کس نے دی؟ حضور نے فرمایا کہ "علیم خبیر نے" مگر حضرت حفصہ نے مارے خوشی کے یہ خبر عائشہ صدیقہ کو کر دی اور تمام مدینہ میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس پر فوراً یہ آیت نازل ہوئی:۔

"اے رسول جو چیز ہم نے تجھ پر حلال کر دی ہے تجھ کو اس کے حرام کرنے کا کیا اختیار حاصل ہے۔ اور اے نبی کی بی بیو اپنے نبی کا راز کسی پر ظاہر نہ کیا کرو۔" (سورۂ تحریم)

اس روایت سے اس بات کا بالوضاحت پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو

کو یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ رسول کریم کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں بلکہ اس کے برعکس ابوبکر و عمر کی خلافت ایک طے شدہ مسئلہ تھا جو خود رسول کے علم سے بھی باہر نہ تھا۔

۲۔ جلاء العیون میں لکھا ہے کہ جب رسول کریم پر مرض الموت کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد فرما دیں۔ مگر حضرت عباس نے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا بلکہ بجائے حضرت علی کے سپرد کر دیجئے[1]

اس روایت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ رسول کریم اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علی ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے

۳۔ ملا باقر مجتہد نے حضرت امام جعفر صادق سے یہ روایت بیان کی ہے کہ "ایک بار نبی کریم نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں خدا تعالیٰ نے سب روا کر دیں۔ آخر شب میں حضرت علی بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسول خدا نے فرمایا "اے علی تمہاری ولایت و خلافت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی[2]

غالباً ہم اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے اس سے زیادہ روشن دلیل

---

[1] جلاء العیون مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ صفحہ ۶۰۔

[2] حیات القلوب جلد سوم صفحہ (۱۰۸۶)۔

اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ اگر میں حدیث گڑھنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ صاف واضح اور غیر مبہم حدیث گڑھنے میں شاید ہی مشکل کامیاب ہو سکتا۔

۴۔ "عیون الاخبار" شیعوں کی معتبر کتاب ہے۔ اس میں حضرت علی سے حسب ذیل روایت منقول ہے۔

فبینا انا امشی مع النبی فی بعض طرق المدینۃ اذ لقینا شیخ طویل ــــــ فسلم علی النبی ورحب ثم انصرف الیّ فقال سلام علیک یا رابع الخلفاء ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" الیس ذلک هو یا رسول اللہ؟ قال بلی۔ ثم مضی۔

"ایک مرتبہ ہم رسول کریم کے ساتھ مدینہ کی کسی سڑک پر چل رہے تھے کہ دفعۃً ہم سے ایک طویل قد انسان سے ملاقات ہوئی۔ اس شخص نے رسول کریم کو سلام کیا اور مرحبا کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا "سلام علیک اے چوتھے خلیفہ، آپ پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو"۔ اس کے بعد اس نے رسول کریم کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کیا یہ چوتھے خلیفہ نہیں ہیں اے رسول خدا؟ آپ نے فرمایا "ہاں" اس کے بعد وہ چلا گیا[1]

ان روایات کو نقل کر دینے کے بعد غدیر خم کے قسم کی تمام احادیث

[1] علمائے شیعہ اس باب میں متفق ہیں کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

اگر قابلِ اعتبار نہیں تو کم از کم شکوک و شبہہ ضرور قرار پا جاتی ہیں -
جس کے بعد ان کو صحیح ثابت کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں - یعنی
(۱) درایت یا (۲) جمہور مسلمین کا عقیدہ - جسے فقہا کی اصطلاح میں
اجماع کہا جاتا ہے -

درایت کے نقطۂ نظر سے الوہی خلافت کا عقیدہ جس قدر قابل
قبول ہے اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے - رہ گیا جمہور مسلمین کا مسئلہ
سو اس میں بھی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ روئے زمین پر جو مسلمان بستے
ہیں اُن میں سے دس بارہ فیصدی سے زیادہ شیعہ عقیدہ کے قائل
نہیں ہیں - ممکن ہے میری اس دوسری شق یعنی جمہور مسلمین کے عقیدہ
کو صحیح ماننے سے شیعہ حضرات کو کچھ اختلاف ہو - اس لئے میں اس
سلسلہ میں عقلی دلیل پیش کرنے کے بجائے حضرت علی کا وہ قول نقل
کر لینا کافی سمجھتا ہوں جو شیعوں کی معتبر کتاب نہج البلاغت میں درج
ہے - یعنی -

ان امیر المومنین قال، الناس جماعۃ ید اللہ علیہم و غضب
اللہ علی من خالف .... انا و اللہ اہل
السنۃ والجماعۃ -

" امیر المومنین نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا

ہاتھ (یعنی کرم) ہوتا ہے۔ اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے خدا اُس پر غضبناک ہوتا ہے ...... خدا کی قسم میں اہل سنت والجماعت ہوں (یعنی سنت رسول کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالبًا مجھے کسی مزید توضیح وتشریح کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

سیاسی اختلاف

اہل تشیع اپنے اختلافات کو مذہبی عقیدہ اور مذہبی مسلک کا اختلاف قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے حضرت علی کی خلافت کے وقت تک کوئی امامت کی قسم کا کوئی عقیدہ یا شیعیت کے موجودہ اختلافی عقائد میں سے کوئی عقیدہ موجود نہ تھا حضرت علی کا خلیفہ ہونا یا نہ ہونا محض ایک سیاسی اختلاف تھا۔ بلکہ میں تو اسے سیاسی بھی نہیں صرف رائے کا ادنیٰ اختلاف کہتا ہوں۔ یعنی بعض اصحاب کی رائے میں وہ موزوں تھے اور بعض کی رائے میں ناموزوں۔ اس امر کو مذہب کی بنیاد و اساس سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا لیکن بدقسمتی سے حضرت علی

کے زمانہ میں ایک نومسلم یہودی عبداللہ بن سبا نے الوہی امامت کے عقیدہ کو سب سے پہلے اہل اسلام کے کان میں پھونکنا شروع کیا۔ یہ عقیدہ یہودی مذہب میں پایا جاتا ہے۔ اور اس لئے اس نے کچھ تو اپنے سابق مذہب کے اثرات کے ماتحت اور کچھ دیگر سیاسی اغراض کے پیش نظر اس عقیدہ کی تبلیغ شروع کر دی۔ اور حضرت علی کی ذات کے ساتھ وہ صفات منسوب کرنا شروع کیں جو ہندوؤں میں رام چندر جی یا یہودیوں میں عزیر کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے مشہور مجتہد فاضل استرآبادی فرماتے ہیں:۔

وکان (عبد اللہ بن سبا) اول من شرع القول بفرضیۃ امامۃ علی۔

"عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علی کی امامت مذہبی فریضہ ہے"۔

اس کے علاوہ نہج المقال، مجمع البحرین، تاریخ طبری اور جلاء العیون وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

عبداللہ بن سبا نے ائمہ کے ساتھ بالکل الوہی صفات منسوب کر کے انھیں انسان سے خدا بنا دیا۔ چنانچہ شیعوں کے مشہور جامع احادیث "کلینی" نے عمار جہنی سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں حضرت علی

فرماتے ہیں :-

انا عین اللّٰہ انا ید اللّٰہ انا جنب اللّٰہ انا باب اللّٰہ۔

"ہم اللہ کی آنکھ ہیں ہم اللہ کے ہاتھ ہیں - ہم اللہ کا پہلو ہیں، ہم اللہ کا دروازہ ہیں -

بحار الانوار جلد دہم صفحہ ۱۱ میں حضرت امام حسین کی زبان سے یہ جملہ منقول ہے -

"ہم اللہ کی اولاد ہیں"

اسی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر ہے کہ امام حسین شہید نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ ابن مریم کی طرح زندہ آسمان پر اٹھائے گئے -

تفسیر ہندی میں شیخ ابوجعفر طوسی شیعہ داؤد بن کثیر سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابو عبداللہ علیہ السلام یعنی امام جعفر صادق سے پوچھا کہ کیا نماز، زکوٰۃ اور حج سے آپ ہی کی ذات مبارک مراد ہے؟ اس پر مستفسر کو جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ "نہ صرف نماز زکوٰۃ اور حج ہی سے ہماری ذات مراد ہے - بلکہ بیت الحرام، بلد الحرام، کعبۃ اللہ اور قبلۃ اللہ سے بھی ہم ہی مراد ہیں -

شیعوں کے مشہور مستند مجموعہ احادیث "اصول کافی" میں لکھا ہے کہ قرآن میں جس جگہ "رب یا ربک" کا لفظ آیا ہے اس سے

حضرت علی مراد ہیں۔

الغرض اس قسم کے عقائد کو اس زمانہ میں بڑی شدت کے ساتھ پھیلایا گیا لیکن حضرت علی نے ہمیشہ ان کے خلاف اپنی نفرت و بیزاری کا اعلان کیا۔ مگر چونکہ مجھے استناد میں صرف اہل تشیع کی زبانوں کے حوالے پیش کرنا ہیں اس لئے کلینی کی مندرجہ ذیل روایت پر اکتفا کرتا ہوں جو سدی سے مروی ہے۔

"فرمایا حضرت علی نے۔ اے اللہ لعنت کر ہمارے دشمن پر اور لعنت کر ہمارے اُس دوست پر جو حد سے بڑھ جائے۔ یعنی مجھ کو میرے رتبہ سے بڑھا دے۔"

اسلام نے توحید پر جتنا زور دیا ہے اور جس بیباکی اور بلند آہنگی کے ساتھ خود رسول کو ایک معمولی انسان ظاہر کیا ہے اُس کے پیش نظر مذکورۂ بالا اعتقاد کا غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہونا کسی طرح بھی محل نظر قرار نہیں پا سکتا اور غالباً اگر سیاسی رائے کا اختلاف اور نسلوں کی باہمی عصبیت کی بنا پر حضرت علی اور آپ کے فرزندوں کی خلافت کا مسئلہ یوں اُلجھ نہ جاتا تو اس قسم کے عقائد رکھنے والا ایک فرد بھی اسلام میں نہ پایا جاتا۔ لیکن حضرت علی اور معاویہ کی جنگ، حسین کی شہادت، اور بنو امیہ کی سخت گیر پالیسی کی

بنا پر یہ عقائد خفیہ خفیہ علی کے حامیوں میں پھیلنا شروع ہو گئے جنھوں نے
رفتہ رفتہ ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کی اور یہی وہ چند عقائد ہیں
جن کو آج شیعیت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے پھر چونکہ یہ عقائد غیر منظم
طور پر ہر شخص کے اپنے ذاتی جذبات واحساسات اور ذاتی عصبیت و
اضافی حالات کے بموجب شائع ہوئے اس لئے شیعوں میں بیسیوں فرقے
پیدا ہو گئے جیسا کہ "کلینی" وغیرہ کتب شیعہ سے پتہ چلتا ہے ۔ چنانچہ کسی صاحب نے
تو "بدر الدجی" نام کے ایک رسالہ میں یہ بتلایا ہے کہ شیعوں میں ستر سے زیادہ
فرقے ہیں اور ان کے نام اور عقائد تفصیل سے گنائے ہیں ۔

بات یہ ہے کہ اول اول تو حضرت علی کی خلافت کا قضیہ محض ایک
سیاسی قضیہ تھا اور اصل مذہب کے بنیادی اور اساسی اعتقادات سے
اُسے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا لیکن بعد میں ناواقف، غیر محتاط اور
خودغرض افراد نے اپنے مقلدوں کے دائرہ کو وسیع کرنے اور ان کو شدت
کے ساتھ اس مسلک پر عمل پیرا بنانے کے لئے خواہ مخواہ اسے مذہبی رنگ دینا
شروع کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سیدھا سادھا سیاسی مسئلہ رفتہ رفتہ ایک
مذہبی عقیدہ میں تبدیل ہو گیا ۔ اور عالم اسلام میں دو مختلف کیمپ بن گئے ۔

لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے شیعہ
حضرات یہاں کی دیگر اقوام کی طرح ابھی تک بدستور جہل و تعصب کی

تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں لیکن بلاد مقدسہ کے شیعہ حضرات کی نظروں کے سامنے رفتہ رفتہ یہ حقیقت بے نقاب ہو رہی ہے چنانچہ مشہور شیعی فاضل مرزا عبدالکریم زنجانی نے شیعہ سنی کے قضیہ پر ایک مبسوط و مفصل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں کہ:-

"اگر ہم شیعہ سنی دونوں کے خیالات کے ضروری اور بنیادی اصولوں کو علمی طور پر اخلاص دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہونچ جائیں گے کہ صرف ایک اہم سیاسی اختلاف رائے ہے جو دونوں گروہوں میں پایا جاتا ہے اور وہ امامت یا خلافت کے نظریہ سے تعلق رکھتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی اختلاف ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں سنی ایک سیاسی نظریہ کو مانتے ہیں اور شیعہ دوسرے نظریہ پر ایمان لاتے ہیں"۔

لیکن اس سے بھی زیادہ قابل مسرت وہ الفاظ ہیں جو شیعیان عراق کے مذہبی پیشوا شیخ زنجباری نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں کامل ذمہ دارانہ حیثیت سے جامعہ ازہر مصر میں ایک تاریخی تقریر کرتے ہوئے بیان فرمائے ہیں۔ آپ نے فرمایا "شیعہ سنی کا اختلاف۔ فی الحقیقت ایک فروعی اختلاف ہے جس طرح کہ سنیوں میں حنفی اور شافعی کا اختلاف ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ اختلاف شیعہ سنیوں کے درمیان حد فاصل بن گیا ہے"۔

آخر میں شیعہ مذہب کے بارے میں ایک بات اور پیش کرکے اس بحث کو

ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

محبت و ہمدردی ہر اصلاحی ادارہ کا بنیادی اصول ہے اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہر اصلاحی ادارہ کی بنیاد اخوت عامہ محبت و ہمدردی کی مضبوط و مستحکم چٹان پر نصب کی جاتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی تحریک عام اس سے کہ اُسے الہامی مذہب کے نام سے تعبیر کیا جائے یا اصلاحی ادارہ کے نام سے اس وقت تک خالص الوہی یا اصلاحی قرار نہیں دی جا سکتی جب تک کہ اُس کی بنیاد بجائے نفرت و عناد کے بجائے خالص محبت و ہمدردی پر استوار نہ کی گئی ہوں یعنی کوئی سچا اور الوہی مذہب اس لئے نہیں آیا کہ انسانوں کے کسی خاص طبقہ کے خلاف نفرت و حقارت کی اسپرٹ پھیلائے ہر چند اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر اصلاحی ادارہ نفرت کی اسپرٹ سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے کیونکہ بہر حال وہ اپنے مخالفوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن اس کی یہ ناپسندیدگی اصل مذہب کی بنیاد نہیں ہوتی یعنی کسی مذہب کا بنیادی عقیدہ یہ نہیں ہوتا کہ الف کو ذلیل سمجھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ ب اچھا ہے اب اس سلسلہ میں اگر ضمناً الف برا ہو جاتا ہے تو ہو جائے اور اس لئے دنیا کے ہر اصلاحی ادارہ میں نفرت و عناد کی اسپرٹ منفیانہ یا سلبی طور پر پائی جاتی ہے نہ کہ اثباتی اور وجوبی طور پر۔

لیکن دنیا میں یہ امتیاز صرف شیعہ مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کی بنیاد

محبت واخوت کے بجائے نفرت وعناد کے جذبات پر قائم کی گئی ہے یعنی
جہاں شیعوں کے بنیادی عقائد میں حضرت علی کو امام ووصی ماننا داخل ہے وہاں
خلفائے ثلاثہ پر تبرا کرنا اور ان کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرنا بھی مذہب کا جز قرار
دیا گیا ہے۔

نفرت وعناد کے اس عقیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل تشیع کے عقائد کی
بنیاد درحقیقت محبت واصلاح پر نہیں ہے بلکہ نفرت وانتقام پر ہے کیونکہ
اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں کسی کو برا بھلا کہنا ہرگز فرض نہ قرار دیا جاتا حالانکہ
خلفائے ثلاثہ کے خلاف داد سخن دینا ہی درحقیقت اصل شیعیت سمجھا جاتا ہے یہی
نہیں بلکہ وہ ان صحابہ کی مدح تک سننے کو تیار نہیں۔

شیعہ حضرات کے یہاں خلفائے ثلاثہ کے برحق ماننے والوں کو کوسنا پیٹنا
فرض بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ شیعوں کے مجموعۂ احادیث "جامع عباسی" میں لکھا ہے
کہ اگر کبھی کسی شیعہ کو اتفاقاً کسی غیر شیعہ کے جنازہ کی نماز پڑھنا پڑ جائے تو اس
کے لئے یہ دعا مانگے:۔

"اے اللہ اس کی قبر میں سانپ اور بچھو متعین کر دے اس کے پیٹ میں
آگ بھر دے۔ اس کو دوزخ میں ڈال دے"

پس جب تک اہل تشیع میں تبرّے کو اثباتی اور وجوبی حیثیت حاصل ہے
اس وقت تک اس فرقہ کے عقائد کو اصلاحی یا الہامی قرار نہیں دیا

جا سکتا۔ بلکہ اسے انتقام و نفرت کے اس جذبہ سے منسوب کیا جائے گا جو عام اخلاق و شائستگی کے بھی سراسر منافی ہے۔ چہ جائیکہ اعلیٰ اخلاق و روحانیت سے۔

ابو سعید بزمی۔ ایم۔ اے

(منقول از رسالہ "نگار" بابتہ جولائی ۳۳ء)

مسئلہ امامت و خلافت

(م ح کے قلم سے)

یاد ش بخیر! میرے محترم نیاز فتحپوری صاحب عجیب دلچسپ انسان واقع ہوئے ہیں، مجھے آپ کا وہ زمانہ یاد ہے جب آپ عالم بالا تشریف لے گئے تھے اور جنت و دوزخ کی سیر میں مصروف تھے، لیکن نتیجہ وہی "ہبوط" ہوا پھر اسی رزمگاہ زہد و معصیت کی طرف لوٹے۔ پھر وہی لیل و نہار، وہی کاروبار، اور وہی نقش و نگار!

نہ جانے کیوں انھیں لامذہب کہا جاتا ہے، لامذہبیت بھی میری ذات میں کوئی مفہوم حقیقی نہیں رکھتی، مذہب کی وسیع گہرائیوں سے کوئی انسان باہر نہیں جاسکتا۔ لامذہبیت بھی ایک مذہب ہے جیسے دہریت یا نیچریت ہے

تعجب نہیں ہوتا ہے پھر نیاز کو لامذہب کہنا کیونکر روا ہو سکتا ہے؟

میں نقش و نگار کا پرستار نہیں ہوں لیکن پھر بھی مجھے جس قدر لطف نظارگی حاصل ہو سکا میں سمجھتا ہوں کہ نیاز کو مذہب اور بالخصوص مذہب اسلام سے بہت کافی شغف ہے ہمیشہ نگار کے صفحات پر مذہبیات کی ایک جاذب توجہ دنیا آباد رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں کوتاہ نظروں کے لئے کوئی وجہ کشش نہ ہو۔ امامت وخلافت کا مسئلہ زہد و تقوی کی طرح کس قدر خشک واقع ہوا ہے لیکن آج وہی مسئلہ نیاز کے لئے موضوع بنتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلی بار اس مشہور مختلف فیہ مسئلہ میں "سنجیدگی" کے ساتھ نگار ہی کے صفحات پر بحث جاری ہوئی ہے کہ جس نے بھی اس میں حصہ لیا متانت نگاری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے کسی (حقیقی یا فرضی) ہرنام صاحب (جس میں ہر نام کی گنجائش ہے) کے نام سے اس بحث کا آغاز ہوا مجھے خبر نہیں کہ انھوں نے کیا لکھا اور کیونکر اس مسئلہ میں شیعی نقطہ نظر کی تائید فرمائی تھی لیکن محمد فاروق صاحب کا تردیدی مضمون "فاران لکھنؤ" میں میری نظر سے گذرا تھا مگر بدقسمتی سے وہ بھی اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔ پھر خود جناب نیاز صاحب کا محاکمہ شائع ہوا اور اس پر آزاد خیال شیعہ کے قلم سے "تبصرہ شائع ہوا۔ یہ دونوں مضامین اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ علماء اہلسنت کی جانب سے نیاز صاحب کی دعوت جواب تاہنوز مستجاب ہوئی یا نہیں میں اپنے ذاتی خیالات کے پیش کرنے میں سبقت کر رہا ہوں، ممکن ہے میری تحریر آزادخیالی و تنگ خیالی کے اصلی نقطۂ نظر کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

تیرہ سو برس کا زمانہ دراز گذر چکا لیکن آج تک گرفتاران ابوبکرؓ وعلیؓ کے درمیان یہ امر محقق ہی نہ ہوسکا کہ مستحق خلافت بلافصل حضرت ابوبکرؓ تھے یا حضرت علیؑ یقین کیجئے ایسے تفرقہ انگیز مباحث پر قلم اٹھانا سخت گرانبار خاطر ہوتا ہے لیکن ضرورتیں مجبور کر دیتی ہیں کہ ایسے فیصلہ طلب مواقع پر اپنے بے لاگ خیالات کا نہایت صفائی کے ساتھ اظہار کر دیا جائے

ایجاز واختصار بیان کے لحاظ سے میں نیاز صاحب کے محاکمہ کی بابت براہ راست کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ جو کچھ اُن کے ارشادات ہیں وہ اُن کے ذاتی خیالات یا بلفظ دیگر "ناگفتہ" معتقدات ہیں۔ فریقین میں سے اُن کی بات کا کوئی پابند نہیں نہ وہ بقول خود کسی کے ترجمان ہیں۔ میرا مقصود صرف آزادخیال شیعہ صاحب کے تبصرہ پر تبصرہ کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر نیاز صاحب کے فرمودات بھی معرض بحث میں آجائیں گے تو اُن کی تنقیح بھی میرے لئے ناگزیر ہوگی۔

تبصرہ میں چند امور پر خصوصیت کے ساتھ زورِ قلم صرف کیا گیا ہے اور فی الحقیقت وہ مباحث ایسے ہی ہیں کہ اگر اُن کے تمام پہلو روشنی میں آجائیں تو کم از کم فہم و بصیرت رکھنے والوں کے لئے صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی، اُن مباحث ضروریہ کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) عصمت انبیا و ائمہ۔

(۲) وصایت جناب امیر کے اثبات کے لئے نصوص قطعیہ۔

(۳) نفس مسئلۂ خلافت۔

(۴) اسلام کے نزدیک ہئیت اجتماعیہ کا مفہوم و اصول

(۵) ہر دو فریق کے روایات پر سیاسی ماحول کا اثر۔

یہ ترتیب سوال صاحب تبصرہ کی ہے، اس میں چند سوالات غیر ضروری بھی ہیں جیسا کہ میرے آیندہ بیان سے ظاہر ہوگا اور ترتیب بھی میرے نزدیک کچھ زیادہ مناسب نہیں، یوں رکھئے:۔

(۱) عصمت انبیا و ائمہ

(۲) مسئلۂ امامت۔

(۳) مفہوم خلافت۔

(۴) اور استحقاق خلافت۔

(۵) نصوصِ قطعیہ دربارۂ خلافت

بس انھیں امور پر اگر سیر حاصل بحث ہو جائے تو مسئلۂ خلافت کے تمام گوشے روشنی میں آجائیں۔

میں اسی ترتیب کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

عصمتِ انبیاؑ و ائمہ

فریقین کے درمیان عصمت انبیا کا مسئلہ میرے خیال میں مختلف فیہ نہیں ہے۔ معرضِ بحث میں صرف ائمہ کی عصمت آتی ہے۔ لیکن چونکہ نیاز صاحب نے عصمت انبیا کی بحث چھیڑ دی جس کی وجہ سے صاحبِ تبصرہ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ عصمت انبیاء کو بھی بکمال و تمام منقح کر دیں اس لئے اخفارِ حقیقت ہوگا اگر میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ اس مسئلہ پر صاحبِ تبصرہ نے معقولیت کے ساتھ بحث کرنے میں بہت کامیاب کوشش کی ہے اگرچہ ذاتی طور سے مجھے اُن کے خیالات سے چنداں اتفاق نہیں ہے اور میں اس مسئلہ میں ایک حد تک نیاز صاحب کے نظریہ کی تائید کروں گا

درحقیقت اس مسئلہ میں الفاظ کی نزاکت کے باعث التباس پیدا ہو گیا ہے، صرف دو چیزیں ہیں، گناہ اور خطاءِ اجتہادی، بھول چوک کو بھی اسی خطاء میں داخل سمجھا گیا ہے حالانکہ یہ ایک علحدہ امر ہے۔

گناہ کی بابت محاکمہ اور تبصرہ دونوں میں بالاتفاق یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں میرے نزدیک بھی یہ درست ہے۔ خطاء اجتہادی اور بھول چوک میں اختلاف ہے۔

نیاز صاحب کے نزدیک انبیاء سے خطاء اجتہادی کا وقوع و صدور ممکن ہے۔ اور بھول چوک ہو جانا بھی منافی عصمت نہیں، صاحب تبصرہ کو اس سے اختلاف ہے، وہ خطاء اجتہادی کو بھی ناممکن الوقوع سمجھتے ہیں (میں ناممکن کا لفظ اسی معنی میں استعمال کر رہا ہوں جو صاحب تبصرہ نے بیان کئے ہیں) ان کے پاس اس کے لئے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر نبی سے امکان خطاء و نسیان اور اس کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ شریعت سے اطمینان و اعتبار ساقط ہو جاتا ہے، اور پھر یہ سارا بنا بنایا گھروندہ دم کی دم میں ڈھیر نظر آئیگا۔ حالانکہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

رسول کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو خالق سے وابستگی کی صورت میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو بحیثیت اس کے بندہ ہونے کے بندوں کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے خالق سے اس کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الٰہیہ کو صحیح طریقہ سے حاصل کر کے باحسن وجوہ اس کو بندوں تک پہونچا دے۔ اسی حیثیت کا اصطلاحی نام رسالت ہے

لیکن اس رسالت کے مسئلہ میں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ رسول کے لئے دو امر ضروری ہیں اول اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح۔ یعنی احکام آلہیہ کو اچھی طرح سمجھ کر لینا اور پھر اُس کی صحیح طریقہ پر نشر و اشاعت کرنا۔

دوسری حیثیت نبی کی وہ ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان، در جملہ لوازمات انسانیہ کے ساتھ متصف ہوتا ہے اسی حیثیت کو بشریت کہتے ہیں۔ اس امر کے واضح ہونے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ عصمت نبی کی کس حیثیت کے لئے ضروری ہے۔ آیا رسالت اور بشریت دونوں کے لئے یا صرف رسالت کے لئے؟

میرے خیال میں رسالت کے لئے عصمت ضروری ہے اور اس کا اعتراف سب کو ہے، وہ گناہ نہیں کر سکتا۔ وہ خدا سے غلط احکام نہیں حاصل کر سکتا، اور نہ اُس کو غلط طریقہ سے دوسروں تک پہونچانے کا مرتکب ہو سکتا ہے

البتہ بشریت کے لئے میرے نزدیک عصمت ضروری نہیں ہے۔ یعنی نبی کے وہ ذاتی امور کہ جو اسی حیات دنیویہ یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اگر کبھی لغزش ہو جائے تو اُس کا کوئی مضر اثر عصمت رسالت پر نہیں مرتب ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ صاحب تبصرہ نے قابل وکیل اور حاذق طبیب کی مثال پیش کی ہے۔ بیشک ماہر قانون داں وہی سمجھا جائیگا

جو پیروی مقدمات کے بارے میں غلطی کرتا ہی نہ ہو یا غلطی ہو جاتی ہو لیکن کم از
کم طبیب حاذق کے لئے ضروری ہے کہ وہ تشخیص امراض و تجویز علاج میں خطا نہ کرتا
ہو یا بہت کم کرتا ہو، یقیناً کم کی قید ہم اپنی انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے
ہیں، اگر خدا کسی طبیب حاذق کو متعین کرے تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ایسا
طبیب "کم سی کم" بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ نہ تشخیص امراض میں نہ تجویز علاج میں،
لیکن ایسے طبیب کے لئے یہ تو ضروری نہیں قرار دیا جائیگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ
میں غلط روی سے معصوم ہو، جہاں تک اس کی حذاقت طبابت کا تعلق ہے
ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ
سکتا، باوجود اس کے وہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں اگر کوئی لغزش
کر جائے تو اس سے اس کی حذاقتِ طبابت پر کوئی حرف نہیں آ سکتا
ہے۔ اس تقریر سے میرا صرف یہ مقصد ہے کہ انسان کے لئے کسی امر واحد
میں کمال اس کو مستلزم نہیں کہ وہ جملہ کمالات کا حامل ہو، ٹھیک اسی
طرح رسالت کا مسئلہ ہے۔ رسول خدا سے احکام حاصل کرتا ہے اور بندگان
تک اسے پہونچاتا ہے۔ اس کے لئے عصمت لازم و مسلم ہے اور اس عصمت
پر کوئی دھبہ نہ آئیگا اگر وہ اپنے دنیاوی امور بشریت میں کوئی لغزش
کر جائے بشریت کی بار بار قید کا اضافہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ کہیں کسی کو
یہ مغالطہ نہ ہو کہ نبی اخلاقی غلطی مثلاً کذب و سرقہ وغیرہ کا ارتکاب کر سکتا ہے،

واضح رہے کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ اخلاقی غلطی تو گناہ کے حدود میں داخل ہے
اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ امر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نبی معصوم رہتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات
کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے جس کو میں اوپر پیش کر چکا۔

تعجب ہے کہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے اپنے مذہب سے .... اغماض کرتے ہوئے
عصمت انبیاء کے مسئلہ میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے حالانکہ اگر مجھے معاف کیا
جائے تو میں عرض کروں کہ مذہب شیعہ میں تو عصمت
نہ الوہیت کے لئے ضروری ہے نہ رسالت کے لئے لازم نہ امامت کے لئے واجب،
وہ خدا سے صریح غلطی کے وقوع کا اعتراف کرتے ہیں چہ جائیکہ رسالت
ملاحظہ ہو بحار الانوار میں روایت ہے جسے علامہ طوسی نے بھی نقد المحصل میں
نقل کیا ہے۔

عن جعفر الصادق انہ جعل اسمعیل القائم مقامہ بعدہ فظہر من
اسمعیل ما لم یرتضہ فجعل القائم مقامہ موسیٰ فسئل عن ذلک فقال
بدا اللہ فی اسمعیل۔

"جعفر صادق سے روایت ہے کہ اُنھوں نے اسمعیل کو اپنا قائم مقام اپنے
بعد کے لئے قرار دیا مگر اسمعیل سے وہ بات ظاہر ہوئی جس کو اُنھوں نے پسند
نہیں کیا لہذا اُنھوں نے موسیٰ کاظم کو اپنا قائم مقام بنایا اس کے متعلق اُن سے

پوچھا گیا تو کہا اللہ کو اسمٰعیل کی بابت بدا ہو گیا۔"

ساتھ ہی ساتھ آپ لغت کے ذریعہ سے لفظ بدا کو بھی سمجھ لیں۔

بدا الہ ای ظہر لہ مالم یظہر

"یعنی جو بات معلوم نہ تھی اس کے معلوم ہو جانے کو بدا کہتے ہیں۔"

اب روایت کا مفہوم واضح ہو گیا کہ اللہ نے پہلے تو اسمٰعیل کی امامت کا حکم دیا پھر اللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور موسیٰ کی امامت کا حکم دیا۔

شیخ صدوق رسالہ اعتقادیہ میں لکھتے ہیں:۔

ما بدا اللہ بنی شیئ کما بدا لہ فی اسمعیل

"اللہ کو کبھی ایسا بدا نہیں ہوا جیسا کہ اسمٰعیل کے بارے میں ہوا۔"

نعوذ باللہ من ذلک خدا سے جہل کے باعث غلطی ہوئی، اور ایسی شدید کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس روایت سے عصمت الوہیت باطل ہوئی اور ضمناً عصمت امامت بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ حالانکہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے امامت کے منصب کو بھی منجانب اللہ ہونا تسلیم کیا ہے اور اسی لئے عصمت لازم قرار دی ہے حالانکہ یہ روایت دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ استبصار صفحہ ۲۱۷ جلد ۱

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال صلی علیہ السلام بالناس علی غیر طہر وکانت الظہر فخرج منادیہ ان امیر المومنین صلی علی غیر طہر فاعیدوا الخ

"جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز بغیر طہارت پڑھی پھر منادی نے اعلان کیا کہ جناب امیر نے چونکہ بغیر طہارت (وہ) نماز پڑھی تھی اس لئے اُس کا اعادہ کرلیا جائے"۔

بالقصد بغیر طہارت تو نماز کی ادائگی تو تسلیم نہیں کی جا سکتی لامحالہ ماننا پڑیگا کہ غلطی ہوگئی یا سہو و نسیان، بھول چوک کہیئے بہرکیف عصمت تو رخصت ہو جاتی ہے۔ ان روایات سے عصمت الوہیت و عصمت امامت کے ابطال پر روشنی پڑتی ہے عصمت نبوت سردست مختلف فیہ ہے، چونکہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس لئے میں اُن کی کتابوں سے رسول کے سہو و نسیان کی بابت کوئی ثبوت نہ پاسکا ممکن ہے کہ ہو' البتہ دیگر انبیاء کی بابت حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں اس قسم کی بکثرت تصریحات ملتی ہیں جس سے انبیاء کی غلطی و غلط فہمی اور لغزش خطاء اجتہادی کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً یہ کہ حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے واپس تشریف لائے تو بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارون پر خفا ہوئے حتیٰ کہ غضبناک

ہو کر اُن کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے محض اس خیال کی بنا پر کہ انہوں نے میرے حکم کی اچھی طرح تعمیل نہ کی۔ حالانکہ وہ بالکل بے قصور تھے۔ حضرت موسیٰ کا یہ فعل غلطی پر مبنی ثابت ہوا۔ یا مثلاً حضرت موسیٰ کو توریت کی تختیوں میں بہت سے علوم دیکھ کر یہ خیال ہو گیا کہ میرے پاس تمام علوم جمع ہو گئے حالانکہ حضرت خضر کے پاس بعض ایسے علوم تھے جو حضرت موسیٰ کے پاس نہ تھے۔ یہ حضرت موسیٰ کی غلط فہمی تھی (تفسیر صافی مطبوعہ طہران) یا مثلاً حضرت موسیٰ علم سیکھنے کے لئے حضرت خضر کے ساتھ ہو لئے تھے۔ حضرت خضر نے فرمایا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میرے کاموں پر تم اعتراض کر دیا کرو گے حضرت موسیٰ نے عہد فرمایا تھا کہ میں صبر کے ساتھ رہونگا۔ لیکن جب حضرت خضر نے کشتی کے تختے توڑ ڈالے تو اُن سے صبر نہ ہو سکا اور ٹوک دیا کہ یہ تم برا کر رہے ہو' یہ واقعہ قرآن عزیز میں بھی بہ انداز بلیغ موجود ہے۔ اس سے حضرت موسیٰ کی بے صبری اور عہد شکنی کا ثبوت ملتا ہے نیز اس واقعہ خاص کی بابت قصور فہمی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یا مثلاً حضرت یوسف جب اپنے والد حضرت یعقوب کے استقبال کے لئے آئے تو گھوڑے سے اُتر کر

پیادہ نہ ہوئے اس خیال سے کہ میں شاہانہ شان و شوکت رکھنے
کے باعث حضرت یعقوب سے افضل ہوں۔ یہ لغزش حضرت یوسف
سے ایسی ہوئی کہ اُن سے نورِ نبوت سلب کر لیا گیا۔ اور کبھی اُن کی
اولاد میں پھر نبی نہیں پیدا ہوا (حیات القلوب جلد اول) یہ تو
دیگر انبیاء کے متعلق حضرات شیعہ کے مذہبی معتقدات ہیں ایک
واقعہ ذات خاص جناب رسول اللہ کا بھی سن لیجئے۔

تفسیر صافی مطبوعہ طہران بہ ذیل تفسیر سورۂ نور تحت آیت
اِفک امام باقر علیہ السلام نے ایک طویل روایت نقل کی ہے
جس کا حاصل یہ ہے کہ :۔

"ماریہ قبطیہ کے پاس جریج قبطی کی آمد و رفت پر
بدگمانی ہوئی تو رسول نے علی کو جریج کے قتل کے
لئے بھیجا اور حکم دیا کہ جا کر جریج کو قتل کر ڈالو علی
تلوار لے کر گئے۔ جریج بھاگے اور ایک درخت
پر چڑھ کر نیچے گرے جس میں اُن کا ستر کھُل گیا
اور یہ ظاہر ہو گیا کہ ان میں نہ علامات مردمی ہیں
نہ علامات نسائیت۔ تب علی رسول کے پاس آئے
اور جریج کی حالت ظاہر کی تو رسول نے فرمایا کہ

شکر ہے خدا کا جس نے ہمارے اہل بیت (یہ
اہل بیت کا اطلاق حضرت ماریہ قبطیہ پر ہو رہا ہے
جو بجائے خود سمجھنے کی چیز ہے) سے برائی دور کردی"۔

اس روایت سے چند امور مستفہم ہوتے ہیں:۔
۱۔ یہ کہ جریج کی بابت رسول اللہ کو غلط فہمی ہوئی
۲۔ جناب امام — کو بھی غلط فہمی ہوئی۔
۳۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر قتل جیسا خطرناک حکم صادر
کر دیا گیا۔
۴۔ احساس غلطی کے بعد حکم واپس لے لیا گیا۔
۵۔ جناب امیر نے حکم رسول کو ایسا واجب نہ سمجھا کہ بہر حال
جریج کو قتل کر دیتے، نبی کی غلط فہمی کو محسوس کر کے اُن کے حکم
کی تعمیل سے باز رہے۔

یہ تو غلط فہمیاں تھیں صریح خطا، اجتہادی کا نمونہ ملاحظہ ہو:
'جنگ صفین میں جناب امیر اولاً ثالثی کے تسلیم کرنے
سے منکر تھے اور اپنی فوج میں اعلان کر دیا کہ ہرگز ثالثی
کو قبول نہ کیا جائے پھر اس کے بعد ثالثی پر راضی ہو گئے
جس کے باعث خود آپ کی فوج کے آدمی خارجی ہو گئے

اور جناب امیر کو بُرا بھلا کہنے لگے کہ تمھیں ایک
رائے پر قرار نہیں، معلوم نہیں تمھاری پہلی رائے
درست تھی یا یہ دوسری رائے صائب ہے۔
بہر کیف تمھیں اپنی امامت میں خود شک ہے۔
یہ ناگوار حالات جب پیش آئے تو جناب امیر
کو بیحد صدمہ ہوا اور کف افسوس ملتے ہوئے فرمایا
کہ:-

ھذا جزاء من ترك العقدة (نہج البلاغہ)
"یہی سزا ہے اُس کی جو مستحکم رائے کو ترک کر دے"

کیا اس سے زیادہ صریح مثال خطائے اجتہادی کی اور دستیاب
ہو سکتی ہے؟ مضمون کی طوالت کا خوف مانع ہو رہا ہے۔ ورنہ
ممکن تھا کہ میں ایسی اور بھی کثیر تعداد میں نظائر و امثال پیش کرتا
بہرکیف جو کچھ پیش کر چکا اُس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ مذہب شیعہ
میں یہ عقیدہ تسلیم شدہ ہے کہ:-

خدا سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔
انبیاء سے بھی غلطی و غلط فہمی کا وقوع ہوتا ہے۔
ائمہ بھی غلطی، غلط فہمی، سہو و نسیان، خطاء اجتہادی سے

مبرا نہیں ہیں، معلوم نہیں کیونکر آزاد خیال شیعہ صاحب نے عصمت رسول و ائمہ پر اس قدر زور قلم صرف فرمایا اور خود اپنے مذہبی مسلمات و معتقدات کے خلاف جس کا اُن کو اعتراف کرنا پڑے گا۔

اس طویل بحث سے ہمارا دعویٰ بہت مدلل ہوگیا کہ رسول کے لئے بشریت میں عصمت ضروری نہیں ہے جس کی تائید مذہب شیعہ سے بھی ہوتی ہے۔ البتہ اہلسنت کا یہ خیال ضرور ہے کہ انبیاء سے اس قسم کی لغزشیں بہت شاذ و نادر ہوتی ہیں اور جب ہو جاتی ہیں تو اُن کو اُس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ اللہ کسی صورت سے متنبہ کر دیتا ہے، اس خیال کے ثبوت میں آیات عبس و تولّی وغیرہ جو جناب نیاز نے نقل فرمائی ہیں وہی کافی ہیں۔ اس بحث کے بعد عصمت امامت کا مسئلہ خود بخود خارج از بحث ہو جاتا ہے درانحالیکہ ابطال عصمت ائمہ کے متعلق خود شیعی لٹریچر میں ایک بہت بڑا انبار بھی موجود ہے۔

مسئلہ امامت

امام کے لغوی معنی پیشوا کے آتے ہیں، شرعی اصطلاح میں بھی یہ لفظ اپنے عموم معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک طرف تو حضرت ابراہیم کو بھی دینی پیشوا فرمایا گیا۔

"انی جاعلک للناس اماما" (میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں)

اور دوسری طرف گمراہی کے پیشواؤں کے متعلق بھی امام ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

"وجعلناھم ائمۃ یدعون الی النار" — وہ پیشوا ہیں کہ جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔

اہل سنت کے یہاں امامت کے لئے کوئی خصوصیت نہیں اور نہ مسئلۂ امامت ضروریات دین سے ہے۔ اس لئے کہ نہ قرآن امامت کے بارے میں کچھ کہتا ہے۔ نہ احادیث رسول سے کوئی خاص بات مستنبط ہوتی ہے۔

معلوم نہیں حضرات شیعہ نے کہاں سے اس مسئلہ کو اخذ کیا ہے اور اس شدت کے ساتھ کہ توحید و

رسالت کے بعد اسے مدار ایمان قرار دیا ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرات شیعہ کے یہاں مسئلۂ امامت کے سامنے نبوت بھی ہیچ ہے، ایک معتبر شیعی روایت کا حاصل ہے۔

کہ حضرت آدم وحوا نے ائمہ کی قدر وعظمت پر حسد کیا اور حسد علامات کفر سے ہے۔ لہذا وہ جنت سے نکالے گئے۔

ائمہ کے مقابلہ میں ایک پیغمبر کی بابت یہ خیالات ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک امامت کا درجہ نبوت سے کچھ بلند و بالا واقع ہوا ہے اور اسی لئے شاید اپنے کو امامیہ بھی کہتے ہیں۔

امامت کا مسئلہ مذہب شیعہ میں ذیل کی خصوصیات رکھتا ہے:۔

امامت ساری دنیا میں صرف قریش کے لئے مخصوص ہے پھر قریش میں سے صرف بنی ہاشم کے لئے۔

بنی ہاشم میں سے بھی صرف علی اور اولاد علی کے لئے اولاد علی میں صرف حسنؓ اور حسینؓ کے لئے۔

حسن اور حسین کی اولاد میں سے صرف حسین کی اولاد کے لئے
اور ان میں سے بھی صرف آٹھ اماموں کے لئے مخصوص ہے۔
میں نہیں بتا سکتا کہ یہ قیود خانہ ساز ہیں یا کہیں سے ماخوذ ہیں
اگر ماخوذ ہیں تو کہاں سے ؟ اس لئے کہ قرآن میں امامت کی بابت
نہ اس قسم کی تصریحات ہیں نہ ایسی کوئی آیت جس سے یہ امور
کسی طرح بھی مستنبط ہو سکیں، احادیث صحیحہ میں بھی ایسی تفصیلات
موجود نہیں در انحالیکہ احادیث پر عقائد کی بنیاد بے معنی ہے
ائمہ کی خصوصیات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں
اور چونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کا
نائب بھی معصوم ہو کہ معصوم کا نائب غیر معصوم نہیں ہو سکتا
ائمہ کا انتخاب منجانب اللہ ہوتا ہے کیونکہ عصمت ایک
باطنی شے ہے جس کی معرفت بجز خدا کے اور کسی کو نہیں
ہو سکتی ہے لہٰذا خدا ہی ائمہ کا انتخاب و تقرر کرتا ہے۔ اگر بندے انتخاب
کریں گے تو غیر معصوم منتخب ہو جائیگا جس سے تمام امت کے
گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے کہ غیر معصوم سے خطا
کا صدور ممکن ہے اور امام کی اطاعت ہر چیز میں ضروری ہے۔
یہ اور اسی قسم کی اور دیگر خصوصیات اماموں پر چسپاں

کی جاتی ہیں اور چونکہ بارِ ثبوت مدعی کے سر ہوتا ہے لہذا مجھ کو
اُن امور کی تردید میں اضاعت وقت کی ضرورت نہیں ہے
تاہم مجھے یہ کہنے میں کسی قسم کا باک نہیں محسوس ہوتا کہ امامت ۔
نبوت کا ترکی بہ ترکی جواب ہے اور مسئلۂ امامت مسئلہ ختم نبوت
کے لئے موت کا حکم رکھتا ہے ۔ ایک نبی مامور من اللہ ہوتا
ہے ۔ معصوم ہوتا ہے ۔ مفروض الطاعۃ ہوتا ہے ۔ نبی کی یہ شان
ہے کہ :۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا

"جو کچھ تم کو رسول حکم دے اُسے اختیار کرو اور جس کام سے
روک دے اُسے چھوڑ دو"

امام جعفر صادق فرماتے ہیں :۔

ما جاء بہ علی فاخذ بہ وما نھی عنہ فانتھی (اصول کافی)

"جو کچھ علی (احکام) لاتے ہیں ان پر عمل کرتا اور جس سے منع کر دیا
اُس سے باز رہتا ہوں"

پھر نبی اور امام میں کیا فرق رہ گیا؟

وجری لھم مثل ما جری لمحمد علیہ السلام ۔ "ائمہ کو بھی وہی
باتیں حاصل ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں"

صاحب حملہ حیدری نے اسی امر کو واضح کیا ہے۔

ہمہ صاحب حکم بر کائنات　　ہمہ چوں محمد منزہ صفات

ترازو کے ایک پلہ میں امامت ہے اور دوسرے میں نبوت

شیعہ مذہب تول رہا ہے اور دونوں پلے برابر ہوتے ہیں۔

وکذلك یجری لائمة الهدیٰ واحد بعد واحد (اصول کافی)

"اور یہی قانون اعتقاد تمام ائمہ (دوازدہ) کے لئے یکے بعد دیگرے

نافذ ہے"۔

اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ امامت کا پلہ جھکتا جا رہا ہے نبوت

کا وزن گھٹتا جا رہا ہے نبی سے عتاب آمیز انداز میں باز پرس

ہوتی ہے۔

یا ایها النبی لم تحرم ما احل الله لك ـــــ "اے نبی جس

جو چیز تیرے لئے حلال کی تھی اُسے تو نے کیوں حرام کر لی؟"

نبی اپنی ذات کے متعلق خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام کرنے کا

مجاز نہیں ـــــ لیکن اماموں کا یہ مرتبہ عالی قابل لحاظ ہے۔

فهم یحلون ما یشاؤن ویحرمون ما یشاؤن (اصول کافی صفحہ ۲۷۸)

امام باقر فرماتے ہیں کہ امکو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں

اور جسے چاہیں حرام۔

امامت نبوت سے بہت اوپر جا چکی حتیٰ کہ اب اُس کے جلوے
زیر قدح میں نظر آتے ہیں۔

استعقب علیہ فی شیٔ من احکامہ کالمتعقب علی اللہ
ورسولہ والرادّ علیہ فی صغیرۃ او کبیرۃ علی حد الشرک باللہ
(اصول کافی صفحہ ۱۱)

"علی پر اعتراض کرنے والا اُن کے کسی حکم کی بابت مثل اس کے
ہے جو خدا اور رسول پر اعتراض کرنے والا ہو اور علی کا رد کرنیوالا
چھوٹی بات بڑی بات میں ایسا ہی ہے جیسا اللہ کے ساتھ شرک
کرنے والا۔"

دراصل شیعہ مذہب [illegible] حضرت آدم سے لے کر [illegible] پر حسد کیا تھا۔ العظمۃ
للہ مسئلہ امامت [illegible] یعنی یہ کہ ختم نبوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے
بلکہ اس کی تابناکیوں کے آگے نبوت کا سراج منیر بھی شمع سحری
ہو کر رہ گیا ہے۔

اور [illegible] صاحب کے نزدیک کیا یہ ہو کسی طرح باور
کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ [illegible] اس مسئلہ کو کسی مصلحت
سے [illegible] رکھا گیا ہے۔ [illegible] حال پر
[illegible] ہیں۔

خلافت کا مفہوم

صاحب تبصرہ نے خلافت کی از روئے اصطلاح شرعی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "نیابۃ عن النبی فی الدین والدنیا" خلیفہ امور دینی (مذہب) و غیر دینی (دنیوی) میں نبی کا نائب ہوتا ہے۔ یہ تعریف مبہم ہے اور کچھ غلط بھی۔ مبہم تو یوں کہ خلیفہ امور کابینہ میں نبی کا نائب تو ضرور ہوتا ہے۔ مگر دین کے صرف ایک حصہ میں جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں کہ نبی کے دینی کام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول اخذ احکام الٰہیہ اور دوسرے اُس کا نشر و نفاذ۔ خلیفہ کو نبی کے پہلے کام سے کوئی تعلق نہیں اس لئے کہ نبی کے بعد اخذ احکام کا کوئی سوال نہیں باقی رہتا اور اس لئے خلیفہ کے لئے عصمت لازم نہیں سمجھتے۔ دوسرا کام نشر و نفاذ احکام الٰہیہ ہے خلیفہ صرف اس امر میں نبی کا نائب و جانشین ہوتا ہے۔ خلافت کی مذکورہ بالا تعریف اس لئے غلط ہے کہ خلیفہ نبی کا امور دنیوی یعنی وظائف بشریہ میں نائب نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ ہر انسان کا ماحول اور گرد و پیش کے حالات بدلگانہ

ہوتے ہیں، ایک مسلمان کے لئے امر سعادت ہوگا کہ وہ مکہ یا
مدینہ میں زندگی گذارے ۔ لیکن شرعاً وہ اس پر مجبور نہیں
اور نہ خلیفہ کے لئے ایسے امور ضروری قرار دئیے جا سکتے ہیں،
اسلامی سلطنت کا قیام خود رسول اللہ صلعم کی حیات ہی میں
ہو چکا تھا اور دارالسلطنت یا پایۂ تخت مدینۂ منورہ تھا ۔ خلفاء
ثلٰثہ کے عہد میں مدینہ ہی دارالسلطنت رہا لیکن خلیفۂ چہارم
جناب علی مرتضیٰ کے عہد خلافت میں حالات کی نوعیت دگرگوں
ہوگئی اور اُن کی مصالح نے مجبور کیا کہ وہ کوفہ کو اسلامی دارالسلطنت
قرار دیں ۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا کیا اور ہرگز اُن کو یہ خیال مانع
نہ ہوا کہ میں خلیفہ ہوں اور بحیثیت جملہ امور میں نائب نبی ہونے
کے میرا فرض ہے کہ مدینہ ہی کو پایۂ تخت باقی رکھوں خواہ وقت و
فضا کا اقتضا کچھ ہی کیوں نہ ہو ۔ کیا ان حالات کے پیش نظر
کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کے لئے جملہ امور میں
نیابت ضروری ہے؟

اصل صورت یہ ہے کہ خلافت و امامت بادشاہت کو
کہتے ہیں لیکن ایسی بادشاہت جو قیام و استحکام دین کے لئے
بہ نیابت پیغمبر ہو ۔ ورنہ وہ خلافت نہ ہوئی صرف ملوکیت یا

قیصریت ہو گی۔ اسلامی خلیفہ کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ قیام و
بقاء دین کے لئے فرائض جہاد کو انجام دے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے کہ
تحفظ اسلام کے لئے جو کوششیں ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے کی جاسکتی
ہیں انھیں کا نام اسلام کے اندر اسلامی سیاست ہے خلیفہ اسی اسلامی
سیاست کا نگراں ہوتا ہے اور بس خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تعزیرات
اسلامیہ کے اندر کسی دفعہ کا اضافہ کر سکے البتہ اس کا یہ فرض ہے کہ اگر کہیں
شعار اسلامیہ سے مزاحمت کی جاتی ہو تو اس کی مدافعت کرے بنا بریں خلافت
کی حیثیت بیک وقت پولیس اور فوج کی سی ہو کہ پولیس کا منصب صرف
نفاذ احکام ہے اور فوج نام ہے انھیں احکام و قوانین کی محافظ طاقت
کا لیکن پولیس اور فوج کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اسمبلی اور کاؤنسل
کے پاس شدہ قوانین میں دست اندازی کریں عملہ خلافت کی اسی حیثیت
کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے
یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان ہی کے
افراد برسرکار ہوں کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس شعبہ میں اپنی خدمات
سے حکومت کو فائدہ پہونچا سکے پھر حکومت الٰہیہ کے بارے میں کیوں ایسی
مہمل شرائط بیان کی جاتی ہیں کہ خلیفہ صرف امام ہی ہو سکتا ہے اور امام
صرف خاندان نبوت کے افراد ہو سکتے ہیں اور ان افراد میں بھی صرف اولاد فاطمہ

اور ان میں صرف اولاد حسین اور ان میں بھی صرف ایک درجن افراد دو
پھر ان خود ساختہ قیود کو منجانب اللہ قرار دیا جاتا ہے کیونکر اسے کوئی عقل
والا انسان باور کر سکتا ہے۔

یہاں تو یہ اہتمام کہ نبوت کو سارے عالم کے لئے عام کیا جا رہا ہے
اور قرآن کو تا قیام قیامت وسعت دی جا رہی ہے۔ اسلام کو دنیا کا آخری
اور ابدی مذہب قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی اسلام کے
بقا و استحکام اور اس کے احکام کے نشر و نفاذ کے لئے خدا صرف بارہ اماموں
کو متعین کرتا ہے جن کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری میں ختم ہو جاتا ہے اور ایک
امام صاحب کو غار میں روپوش رہنے کا حکم دیا گیا جن کا وجود و عدم برابر ہے
پھر اسلام کو یتیم بچہ کی طرح چھوڑ دیا گیا بے بس و بیکس، نہ کوئی اس کا پرسان حال
نہ غمخوار کیا اسی اسلام کو سارے جہان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا، میرا خیال
ہے کہ اس قسم کے معتقدات اسلام کے ساتھ مذاق و استہزا کے مرادف ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ خلافت و امامت بقاء دین کے لئے ضروری ہی لیکن
اسلام کے اندر صرف ایک فروعی مسئلہ کی حیثیت اس کو حاصل ہے
اصولی مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر مدار ایمان و اسلام ہو جس کے انکار و
ابا سے کفر لازم آئے یہ تو وہ لوگ کہہ سکتے ہیں جن کے نزدیک امامت و
خلافت نبوت کے ہم پلہ ہوتی ہے اسی لئے وہ توحید و رسالت کے ساتھ مسئلہ امامت

کو بھی جزو ایمان نہیں بلکہ مدار ایمان قرار دیتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک
امامت وخلافت صرف دینی بادشاہت ہے اگرچہ خود خدا ہی نے کیوں نہ
اس امام یا خلیفہ کا تقرر کیا ہو۔ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں جو
نبی تھے اُن سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جہاد کے لئے خدا کی طرف
سے کسی بادشاہ کو مقرر کرا دیجئے تاکہ ہم اس کی رہنمائی میں جہاد کر سکیں۔
نبی کی درخواست پر خدا نے ایسے بادشاہ کا تقرر کر دیا۔

قال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكا " اُن کے
نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تم لوگوں کی بادشاہت کے لئے مبعوث کیا ہے"۔

طالوت مبعوث من اللہ ہیں فریضہ جہاد کی ادائگی کے لئے نبی کی موجودگی
کی حالت میں تشریف لائے ہیں گویا کہ وہ سیاسی امور میں نبی کے خلیفہ ہیں لیکن
پھر بھی خدا اُن کو ملک کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی
کا خلیفہ دینی بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے وہ نبی کی طرح مفروض الاطاعۃ
یا نبی کا جملہ امور میں نائب نہیں ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری اس مختصر سی بحث سے مفہوم خلافت کی تشریح
اس قدر ہو چکی جو سمجھنے کے لئے کافی ہے اور جس پر عقلاً کسی اعتراض کی قطعاً
گنجائش نہیں باقی رہ گئی۔

اب یہ بحث فیصلہ کرنا باقی رہ گیا ہے کہ امور استحقاق خلافت کیا ہیں؟

امورِ استحقاقِ خلافت

جب یہ امر دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکا
کہ خلافت دینی باشاہ کا نام ہے (اور اسی لئے عام طور سے
آج تک مسلمان بادشاہوں کو خلیفۃ المسلمین کہا جاتا
ہے) پھر اس امر کے طے پا جانے میں کوئی دشواری
ہی نہیں باقی رہتی کہ بادشاہت کا کون شخص مستحق ہوسکتا ہے
یقیناً وہی امور جو بادشاہت کے لئے ضروری ہیں اُن
کی ایک شخص میں موجودگی اس کو مستحق خلافت قرار دیگی۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جو بادشاہت
کے لئے ضروری ہیں کہ بغیر اُن کے کوئی شخص بادشاہ
نہیں ہوسکتا۔
اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ہم کو یہ نظر آتی
ہے سلطنت وحکومت کے لئے جابرانہ قوت اور قاہرانہ
طاقت کا ہونا ضروری ہے جس میں قوت نہ ہوگی وہ
کیا حکومت کرسکے گا۔ اس طاقت کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل
یہ کہ وہ ذاتی طور سے جسمانی قوت کافی رکھتا ہو

فنون جنگ و سپہ گری میں اُس کو مہارت تامہ ہو، اور عزم و ارادہ کی بھی اُس کے پاس غیر معمولی طاقت ہو۔ اور طاقت کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکا انسان ہو۔ اور علم و تدبر سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہو تاکہ امور سیاست کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے اور ملکی نظم و نسق کو عمدہ اسلوب پر قائم کر سکے، اگر کسی میں یہ دو صفات موجود ہیں تو وہ بادشاہت کر سکتا ہے ورنہ ناممکن ہے ملک طالوت کو جب اللہ نے مقرر فرمایا تو بنی اسرائیل کو اُس کی بادشاہت پر اعتراض تھا کہ طالوت کیونکر بادشاہ ہو سکتا ہے، خدا نے اُن کے اعتراض کا یہی جواب دیا کہ طالوت میں بادشاہت کی استعداد و صلاحیت موجود ہے۔

"لوگوں نے کہا طالوت کو ہم پر کیونکر بادشاہی حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ ہم اس کے مستحق ہیں کیونکہ طالوت کے پاس تو کوئی خزانہ (دولت) نہیں" "نبی نے کہا اللہ نے طالوت کو تم پر بزرگی بخشی ہے۔ وہ اُن کو علم (سیاست، و جسم (طاقت) میں کشادگی بخشی ہے، اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دے"۔ (سورہ بقرہ)

اس آیت سے مذکورہ بالا بیان کی اچھی طرح تائید ہوتی ہے، اور پہلے زمانہ کی بادشاہت کے لئے یہی دو شرطیں ضروری قرار دیا سکتی ہیں

خلافت کا مستحق بھی وہی شخص ہوگا جس میں مذکورۂ بالا دو شرطیں موجود ہوں، کیونکہ اس کا مشن[۱۵] صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا نفاذ کرے، حدود اللہ کو قائم کرے اور حفاظت و بقاء دین کے لئے اگر ضرورت پیش آجائے تو مردانہ وار جنگ سے بھی دریغ نہ کرے، ان امور کی انجام دہی کے لئے ضرورت ہے کہ وہ پختہ کار انسان ہو اس کے عزائم میں اس قدر استقلال ہو کہ دوسری طاقتیں اُسے متزلزل نہ کر سکتی ہوں، پرخطر مواقع میں اُس کے پاؤں نہ ڈگمگا سکتے ہوں، وہ ایسی کمزور ذہنیت کا مالک نہ ہو کہ مخالف آراء اُسے ہر موقع پر شکست دے سکیں۔ بلکہ سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والا انسان ہو۔ فہم و تدبر اور فراست و دانائی سے کافی حصہ پایا ہو۔ نڈر ہو اور بیباک، پختہ خیال در راسخ العزم، مشکلات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو، لوگوں پر اُن کی غیر معمولی طاقت کا اثر قائم ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے احکام دوسروں سے منوا سکتا ہو، ایسا شخص خلیفہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خلافت کا مستحق ہے۔ ان شرائط کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ اوصاف و خصائل کسی خاندان یا کسی

[۱۵] چنانچہ خود جناب امیرالمومنین کا قول ہے جس میں امیر (خلیفہ) کے فرائض (نہج صفحہ ۹۹)

قبیلہ یا جماعت کے لئے مخصوص نہیں ہیں جس میں بھی یہ خداداد صلاحیت ہوگی ان اوصاف و کمالات کا وہ حامل ہوگا اس کو حق حاصل ہوگا کہ وہ خلافت کر سکے' یہی اہل سنت کا مسلک ہے کہ وہ خلافت کو کسی گروہ میں محدود نہیں رکھتے...... جن لوگوں نے اہل سنت کے نظریہ کو محدود[1] سمجھا غلط سمجھا ہے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) بیان کئے گئے ہیں۔

لا بدّ للناس من امیر برّ او فاجر یعمل فی امرتہ المومن........

.....ویجمع بہ الفیئ ویقاتل بہ العدو۔ (نہج البلاغہ مصری صفحہ ۱)

"لوگوں کے لئے امیر کا ہونا ضروری ہے خواہ وہ نیک ہو یا بدکار' تاکہ اس کے عہد حکومت میں مسلمان اپنے فرائض ادا کر سکے' مال غنیمت جمع کیا جا سکے اور دشمنوں سے مقاتلہ کیا جا سکے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ اہل سنت کے نزدیک خلافت کو صرف قریش کے لئے مختص سمجھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ الائمۃ من القریش ضرور وارد ہوا ہے۔ لیکن یہ فرمان رسول اُس وقت کے حالات اور ماحول کے لحاظ سے تھا کہ اُس وقت طاقت و قوت کے اعتبار سے قریش ہی کا ایک ایسا قبیلہ تھا جو اور قبائل سے غیر معمولی امتیاز رکھتا تھا اسی لئے امامت و خلافت کا اس کو مستحق قرار دیا ورنہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قریش ہی امامت و خلافت (ملاحظہ ہو صفحہ)

کیا جناب امیر مستحق خلافت تھے؟

یہ ایک ضمنی سوال قائم کیا گیا ہے جو بحث سابق کا تتمہ ہے اور جسے پوری بحث کا خلاصہ کہنا چاہئے۔ نصوص قطعیہ دربارۂ خلافت علی آخری سوال ہے جس پر میں آیندہ بحث کروں گا۔ اُس سے پہلے فہم و درایت کی روشنی میں بھی دیکھنا ہے کہ حضرت علی میں کہاں تک خلافت کی استعداد و صلاحیت موجود تھی کہ یہی اصل بحث ہے۔ لیکن یہ بھی کہونگا کہ اس بحث میں چونکہ ذات گرامی جناب امیر المومنین سے بحث ہوگی اور اُن کے خصائص و کمالات پر اُصول کے ماتحت تنقید و تبصرہ ہوگا کسی کو ناگوار نہ ہونا چاہئے۔ میں بجان و دل اُن کا احترام کرتا ہوں میرے عقیدت و نیاز کی ایک دنیا اُن کے کمالات معنوی و روحانی کے اعتراف کے لئے وقف ہے۔ میں مذہبی تعصب کی دیوانگی میں اُس بلند مرتبت ہستی پر حملہ نہیں کر سکتا جس کا مقدس خون خود میری رگ و پے میں دوڑ رہا ہے۔ لیکن یہ حق ہے حق گوئی و حق بیانی کا کہ حقیقت کے چہرہ سے بلا تکلف نقاب اُلٹ دی جائے۔ میں اس وقت

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) منحصر ہو یہ ایسا ہی جیسا کہ اس زمانہ میں ٹرکی کی بے پناہ عسکری طاقت کو دیکھ کر کہا جائے کہ خلافت کا مستحق ٹرکی ہے اس کے یہ معنی نہ ہونگے کہ ٹرکی ابد الآباد کے لئے خلافت کا مستحق ہو گیا ۱۲

شیعی نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جسمانی طاقت کا اعتراف ایک دنیا کو ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ سلطنت کے لئے جس پختگی عزم جس نظم و ثبات اور جس قوت فکر و مستقل مزاجی کا تذکرہ میں نے ابھی بطور شرائط کیا ہے اُن کا حضرت علی میں اگر فقدان نہ تھا تو کم از کم نمایاں طور سے نقصان ضرور موجود تھا اُن کو دوسروں سے اختلاف رائے کی ہمت کم ہوتی تھی وہ اپنے عزائم میں غیر معمولی طریقہ سے ثبات و استقلال نہیں رکھتے تھے۔ اُن کو خود اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ نہ ہوتا۔ وہ مخالف طاقتوں سے مرعوب ہو جاتے اُن میں وہ قاہرانہ سطوت اور آمرانہ دبدبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے لوگ اُن کی باتیں مان لیتے یا اُن کے احکام پر عمل پیرا ہوتے، یہ وہ حقائق ہیں جو اُن کی سوانح حیات میں روشن حیثیت رکھتے ہیں اُن امور کا اعتراف مجھ کو ہی نہیں بلکہ شیعی دنیا کو بھی ہے، اور شیعی مورخین اُس سے انکار نہیں کر سکتے ہیں حتیٰ کہ خود حضرت علی کو بھی ان اُمور کا اعتراف تھا۔

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت سے اُن کو انکار و اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کے اظہار کی اُن کو کبھی جرأت ہوئی ؟ میں کہونگا کبھی نہیں ہوئی، بلکہ وہ ملاقات تقیہ

کا ظاہری طور سے اعتراف ہی کرتے رہے، اگر کبھی کہیں سے یہ آواز بلند ہوئی کہ حضرت علی کو خلافت ملنی چاہئے تھی تو فوراً حضرت علی انکار کر بیٹھتے اور اپنے لئے مطالبہ خلافت کی زور و شور سے تردید فرمانے حتیٰ کہ خلفائے ثلٰثہ کا عہد گذر جانے کے بعد بھی جب اُن سے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ منصب خلافت قبول فرمالیں تو انکار ہی فرماتے رہے۔

دعونی والتمسوا غیری (مجھ کو معاف کرو کسی اور کو ڈھونڈو)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:-

ان ترکتمونی کانا کاحدکم (اگر تم مجھ کو قبول خلافت سے علحدہ رہنے دو تو میں تمہارے ہی جیسا ایک فرد ہونگا)

کس قدر وضاحت کے ساتھ بتلایا جا رہا ہے کہ میں مستحق خلافت نہیں ہوں، اگر میں خلیفہ نہ ہوا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے حق سے محروم رہا بلکہ جیسے تم لوگ ہو ویسے ہی مجھے سمجھو، پھر ارشاد ہوتا ہے:-

ولعلّی اسمعکم واطوعکم لمن ولیتموہ امرکم۔

"اور شاید کہ میں تم لوگوں کی نسبت اُس کی بات زیادہ مانوں گا اور زیادہ اُس کا فرمانبردار رہونگا جس کو تم خلیفہ بناؤ گے"۔

بہر حال جناب امیر...... اپنے کو مستحق خلافت نہیں قرار دیتے

اور اس جملہ سے تو یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انتخابِ خلیفہ کا حق پبلک کو حاصل ہے نہ کہ خدا کے ذمہ ہے "لمن ولیتموہ" پر غور کرو۔

پھر جناب امیر کا یہ ارشاد بھی قابل لحاظ ہے۔

انا لکم وزیراً خیر لکم منی امیراً (نہج البلاغہ)

"میں تم لوگوں کے لئے امیر (خلیفہ) ہونے کی نسبت بحیثیت وزیر ہونے کے زیادہ مفید ثابت ہونگا"

جناب امیر علم و معرفت میں بڑا درجہ رکھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ میں مستحق خلافت نہیں ہوں اُن کو غالباً یہ بھی علم تھا کہ ابوبکر خلیفہ ہیں پھر عمر ہونگے پھر عثمان، ان کے بعد کہیں شاید یہ درجہ مجھ کو ملے۔ لوگ کہتے کہ آپ ابوبکر کی خلافت پر کیوں خاموش ہیں کیا آپ کو اختلاف کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے تو آپ فرماتے کہ نہیں میں موت سے ڈرنا چہ معنی بلکہ میں اس قدر مانوس ہوں جس طرح شیر خوار بچہ اپنی ماں کے پستانوں سے مانوس ہوتا ہے مگر میں اپنے مخصوص علم کی بناء پر خاموش ہوں اگر اُسے ظاہر کر دوں تو تم میں اضطراب پیدا ہو جائیگا۔ یہ علم مخصوص کیا تھا؟ یہی کہ میرا نمبر تین آدمیوں کے بعد ہے اور اگر یہ مراد نہ ہو تو بھی یہ کہنا پڑے گا کہ وہ خلافت صدیقیہ کی بابتہ خاموش ہی رہے اور اختلاف نہ کر سکے

حضرت علی میں خود اعتمادی کی اسپرٹ کم تھی اپنی رائے پر قائم نہ رہتے جیسا کہ میں نے اس سے پہلے جنگ صفین کا حوالہ پیش کیا تھا کہ اس میں وہ اپنی سابق رائے سے منحرف ہو گئے جس کا نتیجہ اُنھیں کے حق میں خراب نکلا اور خود اُن کو تاسف بھی ہوا کہ استقامت رائے کے ترک کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے اسکے علاوہ ایک جگہ آپ بہ عہد خلافت فرماتے ہیں:۔

"میں نے تم کو اس حکومت سے منع کیا تھا مگر تم نے انکار کر دیا۔
اس طرح جیسے کہ سرد دشمن انکار کر دے یہاں تک کہ مجھے اپنی رائے
تبدیل کرنی پڑی اور وہ کرنا پڑا جو تمھاری خواہش تھی اور تم
لوگ بہت ہلکی کھوپری کے انسان واقع ہوئے ہو"

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی رائے پر قائم نہ رہے اپنی بات منوا نہ سکے اور بیوقوفوں کی بات مان لی۔

حضرت علی کے رعب و دبدبہ اس قدر کمی تھی کہ اُن کی رعایا اُن کا کوئی کہنا ہی نہ مانتی تھی۔ گھبرا کر فرماتے

منیت بمن لا یطیع اذا امرت ولا یجیب اذا دعوت (نہج البلاغہ)

"میں ایسے لوگوں کی خلافت میں مبتلا کر دیا گیا ہوں جو نہ کہنا مانتے ہیں نہ پکار کا جواب دیتے ہیں"

اور یہاں تک نوبت پہونچ چکی تھی کہ ان کی باتوں کو لوگ ذرہ برابر وقعت نہ دیتے۔ اطاعت زمانہ داری تو بعد کی چیز ہے، حتی کہ حضرت علی شکوہ کرتے ہیں اور بد دعا فرماتے ہیں کہ:۔

قاتلکم اللہ لقد ملأتم قلبی قیحا و شحنتم صدری غیظا (نہج البلاغہ)

"اللہ تم لوگوں کو ہلاک کرے، تم نے میرے دل کو زخم کی پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غصہ سے"

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:۔

"تم لوگوں نے مجھے اپنی رائے پر تم نہیں رہنے دیا اس قدر نافرمانی کی یہاں تک کہ اہل قریش کہنے لگے کہ علی بہادر تو ضرور ہیں لیکن علم حرب نہیں رکھتے" نہج البلاغہ

اور کچھ ہی نہیں کہ رسول اللہ صلعم کے بعد ابوبکر و عمر نے لوگوں کو سکھلا پڑھا دیا ہو کہ علی کی مخالفت کیا کرو یا حضرت عثمان اپنے بعد کے لوگوں کو منع کر دینے کی وصیت کر گئے ہوں بلکہ زمانہ نبوت میں بھی یہی حال تھا۔ یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو لوگ اُن کا کہنا نہ مانتے حتی کہ حضور سے آکر اس کی شکایت کی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ آپ کے اندر کوئی خاص قابلیت نہ تھا اور نہیں تھے جس کی بنا پر حکومت کر سکیں۔ مگر لوگ سمجھتے تھے کہ ان کا کہنا

نہ مانیں گے تو یہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتے ۔ ابوبکر و عمر کے عہد میں یہ جرأت کسی بڑے سے بڑے انسان کو بھی نہ ہو سکی ۔

میں نے شیعی لٹریچر سے ثبوت بہم پہنچایا ہے جس سے یہ امر روز روشن کی طرح آشکارا ہو گیا کہ حکومت کے لئے جس عظمت و جلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ حضرت علی میں موجود نہ تھی ، بقول شیعہ حضرات آپ میں اس قدر کمزوری تھی کہ حضرت عمر نے گھر کو آگ لگا دی حضرت فاطمہ کو گھسیٹا اسقاط حمل ہو گیا حضرت فاطمہ نے نہایت سخت سخت باتیں کہہ ڈالیں کہ تم کیسے مرد ہو گھر میں بیٹھے رہتے ہو جیسے ماں کے رحم میں جنین اور ہم پر یہ ستم ڈھائے جاتے ہیں یہ سب کچھ (نعوذ باللہ) ہوا اور شیر خدا کی رگ حمیت میں جنبش نہ ہوئی لہذا اس پر یہ دعوی کہ انہیں کو خلافت ملنی چاہئے تھی ، متذکرہ بالا حالات میں کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ خلیفہ بنائے جاتے تو اسلام کو اسی طرح چار چاند لگ جاتے جیسا کہ ابوبکر و عمر کے زمانہ سلطنت میں لگے ؟ میں کہتا ہوں کہ شیعی تاریخ نے جس نوعیت سے اُن کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اُس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس واقعہ ارتداد پر نظر ڈالو جبکہ رسول کے بعد ارتداد کی وبا پھیل گئی ۔ حضرت ابوبکر نے فوج کشی کرنی چاہی تمام صحابہ بالاتفاق حضرت ابوبکر کی رائے کے مخالف تھے اگر حضرت ابوبکر کی جگہ حضرت علی ہوتے تو یقیناً

مخالف آراء کی اس بھنات کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے سے پھر جاتے، مگر وہ ابوبکر تھے ایک کوہ عزم وثبات، ایک آسمان عظمت وجلال، انھیں اپنی اصابت رائے پر کامل اعتماد واطمینان تھا۔ حضرت عمر جیسا دبنگ انسان اُن کو اپنی رائے سے باز رکھنے گیا لیکن ایسی ڈانٹ بتائی کہ ان کو خاموش ہی ہونا پڑا۔ "عمر! تم جاہلیت میں کس قدر جبار تھے اور اب اسلام میں آکر بزدل ہو گئے" یہ الفاظ تھے جن سے مخاطب کیا تھا۔ خود اعتمادی کا یہ عالم کہ فرماتے "میری زندگی میں اور دین کم ہو جائے، یعنی میں اس دین کا وارث ہوں، وقت کا حاکم ہوں زمانہ کا بادشاہ ہوں میں فضا کی ناسازگاری کو اپنی طاقت سے ہموار کر سکتا ہوں" یہ شان خلافت تھی، ------ یہ شیعی دنیا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت علی سے بھی اس بلند حوصلگی کی توقع ہو سکتی تھی؟

یہ وہ امور ہیں جس کی وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ دینی خلافت کا استحقاق کسی طرح بھی حضرت علی کو حاصل نہ تھا، یہ اور بات ہے کہ حضرت علی سے غلوئے عقیدت یا شیخین سے گہری عداوت کے باعث حضرت علی ہی کو مستحق خلافت ٹھہرایا جائے۔" ولکنّی اقول مالکم لا تکادون تفقہون حدیثا؟

~~~~~~
~~~~~~

نصوص قطعیہ در بارۂ خلافت علی

عقل و درایت کا فیصلہ ہو چکا اب آؤ یہ عبرتناک منظر بھی دیکھو کہ ایک
مغالطہ دعوی کے لئے قرآن سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ مدعی
اپنی کوشش کے اندر کامیاب ہے یا بالکل ناکام؟

صاحب تبصرہ نے بڑے زور و شور سے دعوی کیا ہے کہ خلافت جناب امیر
کے لئے نصوص قطعیہ ایک دو نہیں بہت سی موجود ہیں اگرچہ دو تین کے علاوہ
اور نہ پیش کر سکے۔

نصوص قطعیہ کے پیش کرنے میں صاحب تبصرہ نے ایک گہری مناظرانہ
چال چلی ہے۔ وہ یہ کہ ایک آیت بیان کی اُس میں حدیث کا پیوند لگایا
اور نتیجہ حسب دلخواہ برآمد کر لیا۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایک زاد حبال الانسان کے لئے یہ علمی فریب کاری
کہاں تک جائز ہے فریب ہی کیسی بات ہے میں ان نصوص قطعیہ پر بحث کرنے
سے پہلے مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک احادیث کا
کیا مرتبہ ہے تاکہ آئندہ فہم مقصود میں دشواری نہ لاحق ہو۔

خبر متواترہ احادیث کا درجہ

قرآن عزیز میں متعدد مقامات پر یہ ارشاد
ہوا ہے کہ رسول کے اقوال پر عمل کرو

میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے بگوش خود ایسے رسول کی زبان مبارک سے احکام سنے اُن کو لازم تھا کہ وہ اس پر عمل پیرا ہوتے۔ رسول کا قول اُن کے لئے قرآن کے احکامات سے کم وزنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

لیکن اگر آج کہ تیرہ سو برس کا زمانہ گزر چکا مجھ سے کہا جائے کہ یہ فرمان رسول ہے اس کی تعمیل تم پر واجب ہے تو میرے لئے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا، اس لئے نہیں کہ میں اقوال رسول کو واجب العمل نہیں سمجھتا بلکہ اس لئے کہ جو احادیث کا ذخیرہ میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ میرے لئے کسی طرح قابل اعتماد نہیں اور میرے اعتبار و یقین کے لئے کوئی قطعی دلیل ایسی نہیں کہ میں اس کو قول رسول ماننے پر مجبور کیا جا سکوں۔ یہ درست ہے کہ فن حدیث کی جمع و نشر میں بڑی کوشش و کاوش اور بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ فن اسماء الرجال مسلمانوں کے پاس ایک قابل قدر دلائق فخر شے ہے مگر مجھے کس طرح تم مجبور کر سکتے ہو کہ میں اس کی صحت کا قرآن کی طرح یقین کر لوں۔

اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ یہ حدیث ایسی ہے جس کا سلسلۂ سند رسول تک پہونچتا ہے۔ راوی سارے سچے ہوں، قابل اعتماد ہوں متقی اور ثقہ ہوں ان تمام باتوں کے اذعان کے باوجود

میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ممکن ہے کہ رسول نے ایسا فرمایا ہو اور بس اس سے زیادہ اعتراف کی توقع از روئے عقل فضول ہے غرضیکہ ایسی احادیث جو ظنی ہوتی ہیں ان سے اثبات عقائد، اُن پہ مدار ایمان، اُن سے استخراج اصول اس قابل نہیں کہ تسلیم کیا جاسکے میں نہیں کہہ سکتا کہ اہل سنت کا اس بارے میں صحیح عقیدہ کیا ہے اگر یہی ہے تو عقل کے عین مطابق، اور اگر اس کے خلاف ہے تو ایسا عقیدہ مستحق ہے اس امر کا کہ اُس کو بالکل رد کر دیا جائے، میں اب شیعی احباب سے بھی اسی اصول پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

اب وہ نصوص قطعیہ ملاحظہ ہوں جنھیں صاحب تبصرہ نے پیش فرمایا ہے۔

(۱)

واقعہ بیعت عشیرہ، فرمان رسول ھذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم، "علی میرے بھائی، میرے وصی اور تم لوگوں کے خلیفہ ہیں" مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صاحب تبصرہ نے یا تو یہ سمجھا ہی نہیں کہ "نص قطعی" کسے کہتے ہیں یا دیدہ و دانستہ قبل دینے کی کوشش کی ہے، کیا یہی فرمان رسول نص قطعی ہے؟ اگر انھیں نصوص قطعیہ پر مدار اثبات خلافت علی ہے تو اطمینان رکھنا

چاہیے کہ جنھیں حضرت علی سے عقیدت ہو گی وہ بغیر ان نصوص کے بھی ان کو مستحق خلافت سمجھ لیں گے . . . . لیکن اگر زیرِ نظر نص کے معنی یہ ہیں کہ آیت

انذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک من اتبعک من المؤمنین۔

"اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں اُن سے فروتنی کے ساتھ پیش آ:

کی تفسیر بیعت عشیرہ کو قرار دیا گیا ہے تو دنیائے استدلال کا خدا حافظ ہے، دعویٰ تو اتنا زبردست کر دیا گیا کہ اس آیت سے "باجماع مفسرین" واقعہ بیعت عشیرہ ثابت ہے۔ لیکن اس کے ثبوت میں ایک مفسر کا بھی ایسا سیدھا قول دستیاب نہیں۔ مگر انسان کیوں ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس کا ثبوت نہ دے سکے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اس پر شیعی مفسرین کا اجماع ہے یا سنی مفسرین کا۔ پھر اس کے بعد بیعت عشیرہ کا مرحلہ رہ جاتا ہے کہ اس کا تعلق روایات سے ہے جو کسی طرح قطعی یا دینی نہیں کہی جا سکتیں اور لطف یہ کہ اس روایت کی بدرجہ ظن صحت کا بھی تو کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے۔ پھر کس قدر صریح ظلم ہے کہ ایک محتمل آیت کو لے کر ایک غیر

حدیث کا پیوند اس میں لگا کر خلافت علی کا جامہ طیار کیا جاتا ہے
اور دعویٰ یہ کہ خلافت علی پر یہ نص قطعی ہے ۔
میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں ایک اخلاقی درس دیا گیا ہے
کہ اے نبی مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ "خفض جناح"
عربی کا محاورہ ہے جس کا اردو میں با محاورہ ترجمہ "فروتنی" "کسر نفسی"
یا خاکساری کے ساتھ پیش آنے کے ہیں اس قسم کی نرمی و فروتنی اختیار
کرنے کی بعض دیگر مقامات پر بھی قرآن میں تعلیم دی گئی اور نبی کو
مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے :-

و لو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک ۔
اگر آپ تند مزاج و سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے
بھاگ جاتے "

کاش ہمارے آزاد خیال شیعہ مضمون نگار کی نظر خفض جناح
کے محاورہ پر ہوتی تو یہ غلط فہمی نہ پیش آتی کہ خفض جناح کے معنی
"خلیفہ سازی" قرار دئے جائیں ، میں ان کو دعوت دونگا کہ وہ
ذرا وسعت نظر سے کام لیں ، قرآن عزیز میں والدین کے ساتھ حسن
سلوک اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری ان کے سامنے تسلیم و
انقیاد کی تعلیم ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ واخفض لهما جناح

الذل " (یعنی والدین کے لئے ذلت کے بازوؤں کو جھکا دو)
پھر کیا اس کا یہ مفہوم قرار دیا جائیگا کہ ماں باپ کو اپنا خلیفہ بنا دو؟
قرآن فہمی کا یہ کچھ اچھا ثبوت نہیں۔

(۲)

انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ
ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون ۔

اس کے لئے ملاحظہ ہوں ذیل کی روایات
الخطیب فی المتفق عن ابن عباس عبد الرزاق عبد بن
حمید ابن جریر ابو الشیخ ابن مردویہ عن ابن عباس
طبرانی فی الاوسط ابن مردویہ عن عمار بن یاسر ابو الشیخ
ابن مردویہ عن ابی طالب ابن ابی حاتم ، ابو الشیخ ابن عساکر
عن سلمۃ بن کھیل ، ابن جریر عن مجاھد ابن جریر عن السدی
عتبۃ بن حکیم ، طبرانی و ابن مردویہ ابو نعیم عن ابی رافع
ابن مردویہ عن ابن عباس (درمنثور للسیوطی)

ان روایات میں یہ مذکور ہے کہ یہ آیت اس وقت
اتری جبکہ حضرت علی نے ایک سائل کو بحالت نماز انگشت شہادت
سے اتار کر انگوٹھی دیدی تھی ۔

صاحب تبصرہ نے یہ دوسری نص قطعی پیش فرمائی ہے اور میں جانتا ہوں کہ حضرات شیعہ کی سب سے بڑی مایہ ناز دلیل یہی ہے شیخ حلی نے الفین میں اس بات کا التزام کیا تھا کہ وہ خلافت علی پر دو ہزار دلیلیں قائم کرینگے۔ شیخ حلی نے بھی اپنی سب سے پہلی دلیل اسی آیت کو قرار دیا ہے۔

لیکن جب اس دلیل کو تحلیل کر دیجئے تو بالکل لاشئے نظر آتی ہے، میں بتاؤں گا کہ اس آیت سے استدلال میں کس قدر فریب سے کام لیا گیا ہے تاہم یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس آیت میں بھی روایت کا پیوند جوڑا گیا، دلیل کی قطعیت تو اسی حرکت ناشائستہ کے باعث سوخت ہوگئی کہ روایت قطعی نہیں ہوتی ظنی ہوتی ہے دوسری شے یہ ہے کہ روایت کی نقل میں --- --- تہذیب مانع ہوتی ہے ورنہ میں کہتا کہ بڑی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا گیا ہے، درمنثور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ درمنثور وہ کتاب ہی جس میں مصنف نے بغیر التزام صحت دنیا بھر کی صحیح وغلط، رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں کہ جس کا بیشتر حصہ صرف "خرافات" ہے اس کتاب سے آپنے چند مصنفین کے حوالے پیش کر دئے کہ ان ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں نے

اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے یا نقل کر کے رد کر دیا ہے، یہ بھی نہیں ظاہر کیا گیا ہے، اس روایت کی سند کیا ہے، رواۃ کیسے ہیں؟ ان چیزوں سے آنکھ بند کر کے محض فریب دینے اور ناواقف کو گمراہ کرنے کے لئے دو دو چار کتابوں کے نام نقل کر دئے کہ ان ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے چاہے وہ روایت جعلی ہی کیوں نہ ہو، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ روایت قطعی جھوٹی اور جعلی ہے اس کی صحت کا ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جا سکتا۔

اس کی صحت کا اثبات ایسا ہی ناممکن ہے جیسے شب تاریک کو روز روشن ثابت کرنا۔ بخلاف اس کے دوسری روایات اس کے متضاد واقع ہوئے ہیں جس کا اعتراف خود صاحب تبصرہ کو بھی ہے پھر وہ کیوں قابل قبول نہیں ہیں؟ اس کا جواب کچھ نہیں ہے۔

پھر کیا انھیں جھوٹی حدیثوں سے اثبات خلافت علی ممکن ہے؟

حدیث کی تو یہ حقیقت تھی، آیت کی نوعیت ملاحظہ ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس سے مراد حضرت علی ہی کی ذات ہے تو زیادہ سے زیادہ ان کا ولی ہونا قرآن سے ثابت ہوا ——— لیکن ولی سے خلیفہ ہونا مراد لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ولی بمعنی حاکم اور خلیفہ حاکم ہوتا ہے۔ لیکن یہ کس قدر اندھیر ہے کہ ایک

لفظ کے ایسے معنی مراد لئے جائیں جو حقیقۃً اس کے نہ ہوں، لغت عرب میں کہیں ولی
کے معنی حاکم کے نہیں آئے البتہ والی کے معنی حاکم کے آتے ہیں رضا شاہ کو والی
ایران تو کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے لیکن ولی ایران نہیں کہا
جا سکتا ہے نہ کہا جاتا ہے، والی شام، والی عراق وغیرہ مستعمل ہے
ولی شام کہنا لغت میں ایک جدید اضافہ ہوگا شیعی مسجدوں سے
اشہد ان علیا ولی اللہ کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں کیا
حضرات شیعہ کے نزدیک اس ولی اللہ کے معنی والی اللہ کے ہیں؟
کیا حضرت علی کو اللہ کا حاکم (والی) قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر اسی
آیت میں ولی کے معنی حاکم کے ہو جائیں گے، میرے دوستو انصاف
پر ظلم نہ کرو، لغت اٹھا کر دیکھو ولایت کا لفظ دو طرح سے مستعمل
ہے واؤ پر فتحہ (زبر) وَلایت۔ اور واؤ پر کسرہ (زیر) وِلایت،
پہلے کے معنی حکومت کے ہیں جس سے والی بنا ہے اور دوسرے
کے معنی محبت کے ہیں جس سے ولی مشتق ہے اور اس کی جمع
اولیاء آتی ہے۔ والی کے معنی حاکم کے ہیں۔ ولی کے معنی دوست
کے ہیں۔ قرآن میں بکثرت ولی، اولیاء کے الفاظ وارد ہوئے
ہیں اور ہر جگہ دوست ہی کے معنی ہیں" المؤمنون والمؤمنات
بعضہم اولیاء بعض " مسلمان مرد و عورتیں بعض بعض کے دوست ہیں۔

تفاسیر اہل سنت سے یہ منقول کیا ہے حالانکہ یہاں جو سالم ہے اس
کی بھی تفسیر نمونہ دیکھئے جیسے

تفسیر جلالین شریف میں اس آیت کے تحت یہ بیان کیا گیا ہے:-
نزلت فی عبد اللہ بن سلام   یہ آیت حضرت عبد اللہ بن سلام
کے بارے میں نازل ہوئی۔

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں اس روایت پہ بحث کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:-

قد وضع بعض الکذابین حدیثا مفتری ان ھذہ الآیۃ
نزلت فی علی لما تصدق بخاتمہ فی الصلوۃ وھذا کذب باجماع
اھل العلم والنقل۔

"بعض جھوٹوں نے یہ روایت گھڑلی ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے
بارے میں نازل ہوئی جبکہ نماز میں انھوں نے انگوٹھی صدقہ کی حالانکہ
یہ بالکل ...... جھوٹ ہے"۔

علامہ ابن حجر عسقلانی الکاف الشاف کے اندر لکھتے ہیں :-
کہ یہ انگشتری والی روایت ثعلبی نے بیان کی ہے لیکن اس
کی سند ساقط ہے"۔
علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں انھیں روایتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

اللہ آپ کو لوگوں سے مامون رکھے گا۔"

آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے قطعاً مکمل واضح اور مستقل حکم کی حامل ہے نہ کوئی خفا ہے نہ ابہام، نہ ایجاز نہ اجمال۔ اور اس قسم کی متعدد آیات اور بھی قرآن میں موجود ہیں جن میں تبلیغ کی شدید تاکید کی گئی ہے۔

لیکن یہ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ اس آیت کو خلافت علی پر نص قطعی قرار دیا جاتا ہے اور اس کو بڑی روشن دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ صاحب تبصرہ نے بھی بڑے زور و شور سے اس کو بیان کیا ہے۔ اور اس سے پہلے شیخ حلی نے بھی "منہاج الکرامہ" میں پیوستہ آیت کے بعد اسی کا ذکر کیا ہے۔

طرز استدلال یہ ہے کہ آیت میں جس چیز کی تبلیغ کا حکم ہے وہ حضرت علی کی نیابت و خلافت ہی کا حکم تھا، عام احکام شرعیہ کی تبلیغ کا حکم مراد نہیں ہے۔ آیت کا شان نزول جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ بہت دلچسپ اور سننے کے قابل چیز ہے۔

رسول اللہ اپنے آخری حج سے واپس ہو رہے تھے مقام "غدیر خم" پر پہونچے تو جبرئیل تشریف لائے اور انھوں نے کہا کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ آپ اس مجمع میں علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیجئے رسولؐ نے عذر کیا کہ مجھے خوف ہے اعلان خلافت علیؓ کے بعد لوگ آمادہ قتل و قتال

نہ ہو جائیں جب جبرئیل واپس گئے خدا سے سب ماجرا بیان کیا تب یہ آیت اتری کہ
اے نبی جو حکم نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر دیجئے ورنہ آپ فرائض رسالت
کے ادا کرنے والے قرار نہ دئے جائیں گے۔ مگر پھر بھی رسول کو تامل رہا
یہاں تک کہ خدا نے حفاظت کا وعدہ کیا تو آپ نے خلافت علی کا اعلان
کیا اور ایسے الفاظ میں کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" میں جس کا مولا
ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کی تاویل اس سے بہتر نہیں کی جاسکتی
اور ہوگا اسے اسباب کی ندرت فکر و بلند خیالی کی داد دینی پڑتی ہے
استدلال کے جائزہ لینے کے ساتھ روشنی میں آچکا ہے اب وقت ہے کہ
تنقیدی نگاہ کے ساتھ اس کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے

اول تو نفس تفسیر ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اگر آیت کو روایت سے علحدہ
کر دیا جائے تو استدلال کا سارا بنا بنایا گھروندہ خاک میں مل جاتا
ہے اس لئے کہ آیت میں تو اشارۃً کنایۃً کسی طرح خلافت کی بو تک
نہیں آتی ہے چہ جائیکہ اس کو خلافت علی پر نص قطعی قرار دیا
جائے کہ میرے نزدیک یہ ایک غیر منصفانہ زبردستی کے سوا کچھ نہیں پھر بیباکی
کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اس حدیث کو اہل سنت کے یہاں بھی تسلیم کر لیا گیا
ہے۔ حالانکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر بیباکی کے ساتھ ایسے

غلط طور پر یہ کہے جاتے ہیں دیگر محدثین کی تصحیح میں انداز
کیا جاتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنہ میں لکھتے ہیں:—

اما قوله من كنت مولاه فعلي مولاه فليس في الصحاح ..
ونقل عن البخاري وابراهيم الحربي وطائفة من اهل العلم
بالحديث انهم طعنوا فيه وضعفوه وقال ابو محمد بن حزم لا
يصح هذا الحديث من طريق الثقات اصلا۔

لیکن یہ قول من کنت مولاہ صحیح احادیث میں نہیں ہے اور امام
بخاری و ابراہیم و دیگر محدثین سے منقول ہے کہ ان حضرات نے اس روایت
پر تنقید و جرح کی ہے اور اس کو ضعیف بتلایا ہے ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ
حدیث بسند ثقات کسی طرح صحیح نہیں ثابت ہے۔

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں تحریر فرماتے ہیں:—

"کہ اس حدیث پر جرح کرنے والی ایک جماعت ان محدثین کی ہے
جن پر جرح و تعدیل کا دارومدار ہے جیسے ابوداؤد سجستانی اور ابوحاتم
رازی وغیرہ"

پھر کیا یہ دعویٰ شرمندہ معنی ہو سکتا ہے کہ اہل سنت نے بھی اس حدیث
کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور میں تو کہتا ہوں اہل سنت کا ذکر کیا خود بعض شیعی دائرہ

ہوئی ہو۔ سی بھی اُس کے سوا ہیں بزعم شیعہ ہیں جس کا ولی یا حاکم یا خلیفہ
ہو وہ اُس کے علی بھی والی یا خلیفہ ہیں۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا
! بس

خدا نے رسول کی بابت فرمایا ہے:

فان اللّٰہ ھو مولٰہ وجبریل و صالح المومنین

شیعی نقطۂ نظر سے اس کا یہ ترجمہ ہوا کہ رسول کا۔۔۔ خدا حاکم و والی ہے
اور جبریل اور مومنین صالحین یعنی تمام مومنین صالحین اور جبریل سب کے
سب نبی کے خلیفہ ٹھہرے۔ کیا قرآن کے ساتھ یہ مذاق نہیں ہے؟ اس کے علاوہ
ابھی کہا اھوں ان تمام چیزوں سے قطع نظر کر لو استدلال کی ماہیت پر غور
کرو تو جس میں خدا اور رسول کے ساتھ کس قدر گستاخیاں ہیں اور اسلام کے
ساتھ کیا بھدا ہوا تمسخر ہے۔

صورت حال تو یہ ہے کہ نبی نے ساری عمر تبلیغ کی مصیبتیں جھیلیں،
دلیں برداشت کیں صعوبتیں اٹھائیں مسلسل مساعی ان تھک
محنت ۔۔۔ پیہم جد و جہد کی لیکن بجز چند نفوس کے ۔۔۔۔۔۔ جنہیں انگلیوں پہ
گنا جا سکتا ہے کوئی سچے طور سے مسلمان نہ ہوا۔ ہوں تو لاکھ چوبیس
ہزار مسلمان ۔۔۔ یہ وقت مسلمان کہلانے کیلئے تو تھے۔ مگر درحقیقت سب منافق
بے ایمان خدا اور رسول کے دشمن اور خاندان رسالت کے خون کے پیاسے

کیا تو پھر اس غدیر خم کے افسانہ کا کیا حشر ہوگا جس میں ایک لاکھ انسانوں کے سامنے میں خلافت علی کے اعلان کئے جانے کا تذکرہ ہے۔

کیا یہ جرأت کی جا سکتی ہے کہ اصول کافی کی روایت کو غلط قرار دیا جائے جس کی بابت امام غائب کا ارشاد ہے کہ ھذا کاف لشیعتنا "یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لئے کافی ہے" یا یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ امام باقر کے قول کو غلط قرار دیتے ہوئے درانحالیکہ وہ معصوم تھے بہر حال اس روایت کا کیا جواب دیا جائیگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمارا راز برابر پوشیدہ رہا یہاں تک کہ اولاد کیسان کے ہاتھ میں پہونچا۔ انھوں نے اس کو گلیوں اور دیہاتوں میں پھر کر بیان کر دیا۔ (اصول کافی مطبوعہ لکھنو)

یہی خلافت بنی فاطمہ کا قصہ تھا اور یہی وہ مایہ ناز دلیل تھی جس کے بیان کرنے میں صاحب تبصرہ نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ آیت میں باندھ کر بے سند روایت کا پیوند لگایا گر پیوند بھی ایسا کہ جس کے تار تار بکھرے ہوئے ہیں۔

(۴)

وأتوا البيوت من أبوابها "اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو"۔

یہ بھی خلافت علی پر ایک نص قطعی ہے اور وہ یوں کہ رسول کا ارشاد ہے کہ "انامدینۃ العلم وعلیؓ بابھا ومن اراد البیت فلیات الباب" میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں جس کو گھر میں آنا ہو وہ دروازہ سے آئے" پس خلافت علی اس آیت سے ثابت ہوگئی ٹھیک اسی طرح جیسے ایک "ذاکر" نے قل سو ہو اللہ احد سے شہادت کربلا کا واقعہ یوں استنباط کیا تھا کہ وہ خدا ایک ہے جس نے عرب میں ایک نبی بھیجا تھا اور اس نبی کے ایک صاحبزادی تھیں فاطمہ اور ان کے دو لڑکے تھے حسن اور حسین، یہی حسین کربلا میں شہید ہوئے تھے سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کے ساتھ کیوں مذاق کیا جاتا ہے، یعنی آیت سے ساتھ روایت کا دامن باندھنے پر بھی تو خلافت علی کا اثبات نہیں ہوتا چہ جائیکہ صرف آیت سے اثبات کیا جاسکے اور پھر درایت کی روشنی میں روایت کو دیکھئے تو ناگفتنی کمزوریاں نظر آتی ہیں، اوّل تو سند کے لحاظ سے یہ روایت پایۂ استناد تک نہیں پہنچتی، پھر یہ بھی قابل غور امر ہے کہ کسی شہر کا دروازہ صرف ایک نہیں ہوتا بلکہ کئی ایک ہوتے ہیں اور عموماً چار دروازے ہوتے ہیں۔ تنہا علی کو باب مدینۃ العلم کہنا غلط ہے، پھر یہ بھی طے شدہ امر نہیں کہ علی کے لفظ سے ابن ابی طالب مراد ہیں یا لغوی معنی "بلند" مراد ہیں، لغوی معنی مراد لینے کے بعد

روایت کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی دروازہ ہیں۔ مگر اس شہر کا دروازہ دروازہ کی بلندی کے اظہار سے شہر علم کی اہمیت کا اظہار مقصود ہے اور میں کہتا ہوں کہ ان امور سے قطع نظر بھی کر لو۔ اگر صرف حضرت علی کا مبلغ علم ہی ان کی خلافت کے لئے وجہ استحقاق ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت عثمان کو اولین خلافت کے مستحق نہ قرار دیے جائیں کیونکہ حضرت علی نے حضرت عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :-

نلک تعلم ما نعلم (نہج البلاغہ) ۔۔۔ بیشک آپ وہ سب کچھ جانتے ہیں جو میں جانتا ہوں۔

پھر کیا یہ علم کی سند بھی حضرت عثمان کو اولین خلافت کی مستحق نہیں قرار دے سکتی؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسی روایات کی صحت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی ان اصحاب کی صرف جزئی فضیلت کا ثبوت ملتا ہے اور یہ ایسی روایات فضائل کو مسئلہ خلافت و امامت سے کیا تعلق؟ اگر صرف علم ہی دنیا میں وجہ حکومت و فرمانروائی ہو سکتا تو شاید آج اونچے درجے کی حکومت پر ہٹلر و مسولینی قابض نہ ہوتے، زمام سلطنت اشتالین اور مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں میں نہ ہوتی نہ ہی ولیرا اور جنرل فرانکو کی قیادت

نہ تسیم کی دقت اور معرف کیا جائے ایران کے تحت یہ رضا شاہ کی ہوتی
نہ ہوتے بلکہ کوئی قبلہ "سرکار شریعتمدار" دولت افزود ہوکر اجلال
دیتے۔ مگر اس نیک مادی دنیا کا ازل سے کچھ عجب دستور رہا ہے کہ
اس نے صرف "زہد و اتقا" کو کبھی مایہ حکومت نہیں سمجھا اور شاید
یہی وجہ ہوئی کہ امیر المومنین گو منصوص من اللہ تھے مگر دنیا کی مادی
طاقتیں نہ جانے کیوں اس کے خلاف تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے
بھی خاموشی ہی اختیار کی رسول نے بھی سکوت ہی میں مصلحت سمجھی
علی شیر خدا کی آنکھوں کے سامنے منافقوں نے تخت و تاج سنبھالا
خوب خوب داد جہانبانی دی اور سوچنے کی بات ہے کہ وہی تیغ جن کا تیغ سے
چلانے والا وہی شیر خدا کہ جس نے بڑے بڑے بہادران عرب کو خاک و
خون میں ملا دیا تھا اور بڑے بڑے پہلوانوں کا ان کے نام سے
زہرہ آب ہو جاتا تھا مگر وہ ابوبکر و عمر کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے
اس لئے کہ آواز کامیاب نہ ہوتی قوم ان کی قیادت کسی طرح
گوارا نہ ہوتی کہ حضرت علی سے بہت زیادہ وہ طاقتور اور تجربہ کار
تھے اور حکومت کے لئے علم و تقوی درکار نہیں۔

صاحب تبصرہ نے جو نصوص قطعیہ پیش کی ہیں ان کی حقیقت
بہت تھوڑی اس طرح نمایاں ہوئی کہ منصف مزاج کو فیصلہ کرنے میں

آسانی ہوگی۔

جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے — اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

صاحب تبصرہ سے میں عرض کرونگا

بہ متاع خود چہ نازی کہ بشہر درد منداں — دل غزنوی نیرزد بہ تبسم ایازے

دیکھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں صراحتہً تو درکنار اشارۃً
بھی کہیں خلافت علی کا کوئی پتہ نشان موجود نہیں اور قرآن سے ثبوت
کیونکر مل سکے کہ یہ مسئلہ تو "ابن سبا" کی ذہنی خلاقی کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ
ہو رجال کشی صفحہ ۷۱

"بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا پہلے یہودی تھا
اور حضرت یوشع بن نون کے بارے میں غلو کیا کرتا تھا پھر مسلمان ہوا
اور حضرت علی سے محبت کرنے لگا، اور نبی علیہ السلام کے بعد حضرت
علی کے بارے میں بھی ویسا ہی غلو کرنے لگا۔ یہ ابن سبا پہلا شخص ہے
جس نے امامت علی کے فرض ہونے کو شہرت دی اور اُن کے دشمنوں
پر تبرا کیا اُن کے مخالفوں کی تکفیر کی، اسی لئے حوادث شیعوں کے
[illegible] ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تشیع کی بنیاد یہودیت سے ماخوذ ہے"
[illegible] ہیں: نام زمہ ابر [illegible] دین یہودی [illegible]

اسی لئے زمانہ سابق کے شیعی علما نے یہ راہ اختیار کی کہ قرآن کو
محرف قرار دیا اور یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ اس قرآن سے وہ تمام آیات
حذف کر دی گئیں جن میں خلافت و امامت کا تذکرہ تھا۔ یہ راہ آسان
تھی، عموماً سب نے یہی راہ اختیار کی اور جہاں تک میری معلومات کا
تعلق ہے میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جمہور شیعہ تحریف قرآن
کے قائل و معتقد ہیں۔ بڑی تتبع اور استقراء کے بعد صرف چند شیعوں
کی بابت یہ معلوم ہو سکا کہ وہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ورنہ ان کے
علاوہ "ہمہ خانہ آفتاب" کا مصداق ہے۔

علامہ نوری طبرسی فصل الخطاب صفحہ ۳۲ میں لکھتے ہیں:۔

الثانی عدم وقوع التغییر والنقصان فیہ وجمیع ما نزل علی
رسول اللّٰہ ھو الموجود فی ایدی الناس فیما بین الدفتین والیہ
ذھب الصدوق فی عقائدہ والسید المرتضی وشیخ الطائفۃ فی
التبیان ولم یعرف من القدماء موافق لھم۔

"دوسرا قول قرآن کے اندر عدم تحریف کا ہے یعنی جو کچھ رسول پر
نازل ہوا فقط وہی صرف بین الدفتین موجود ہے۔ اس مذہب کے قائل
شیخ صدوق، سید مرتضیٰ اور ابو جعفر طوسی شیخ الطائفہ ہوئے ہیں۔ متقدمین میں ان کے سوا
ان کے موافق کوئی بھی نہیں۔"

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۲۴ میں ہے۔

والی طبقتہ ای المرتضی، لم یعرف الخلاف صریحا الامن

ھذہ المشائخ الاربعۃ۔

"یعنی شریف مرتضی کے طبقہ تک تحریف قرآن کی صراحۃً مخالفت بجز ان چار بزرگوں کے اور کوئی نہیں جو شیخ بزرگ ابو علی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان ہیں)

ظاہر ہے کہ پورے مذہب والوں میں سے صرف چار شخصوں کے انکار تحریف قرآن کو کیا وقعت دی جا سکتی ہے۔ جمہور شیعہ تو مانتے ہیں کہ قرآن میں قطع و برید کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے جب تم شیعوں کا مذہبی لٹریچر دیکھو گے تو تم کو ایک روایت بھی ایسی نہ ملے گی جس کا یہ مفہوم ہو کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو حضور پر نازل ہوا تھا بخلاف اس کے تحریف قرآن کی بابت روایتیں ڈھونڈھو تو میں تم سے بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ڈھائی ہزار روایتیں ملیں گی جن میں اکثر و بیشتر ائمہ معصومین سے مروی و متعلق ہیں۔ یہ بحث بہت طویل ہے ورنہ میں مفصل طور کے ساتھ بتاتا کہ کیونکر شیعہ حضرات تحریف کے قائل ہیں۔ اگر کسی کو اس کا ثبوت حاصل کرنا منظور ہو تو وہ اصول کافی مصنفہ یعقوب کلینی، تفسیر قمی مصنفہ علی بن ابراہیم قمی، احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران،

[illegible] سے تھا یعنی ادعائے خلافت علی کے منصوص ہونے کا منکر تھا
لیکن اس کے بعد اگر ضرورت محسوس کی جائے یعنی اہل سنت کے متعلق
مسئلہ [illegible] دیکھنے کی خواہش ہو کہ کس حد تک عقل و درایت کے ساتھ
چسپاں ہے تو میں اذعان و یقین کی طاقت پیش [illegible] ہوئے
[illegible] آہنگی سے دعوی کرتا ہوں کہ خلفائے ثلثہ بالخصوص
[illegible] خلافت برحق تھی وہ غاصب خلافت نہ تھے بلکہ مستحق خلافت
تھے [illegible] اس مسئلہ کو درایت کے علاوہ قرآن کی تابناک روشنی میں
پیش کر سکتا ہوں کہ جس سے انکار کی سر مو گنجائش ناممکن ہوگی اور
یہ وہ صورت نہ ہوگی کہ ادعائے باطل کے اثبات کے لئے جب دلائل و
حجج کی دنیا میں قدم رکھا گیا تو ہر ہر قدم پر بیکسی نے فریاد کی اور ہر
گام پر [illegible] نے مرثیہ پڑھا، درایت نے دامن تھاما اور عقل نے
ہاتھ [illegible] غرض بیچارگی کی جس قدر [illegible] ہو سکتی ہیں وہ خود
خود [illegible] کے حق میں برق و شرر ثابت ہوئیں۔

آزاد خیال شیعہ صاحب [illegible] جواب میں لکھ رہا تھا اور
[illegible] نظرت گذر [illegible]
[illegible] رسالہ شائع ہو چکا [illegible]

آزاد خیال شیعہ صاحب کے جواب میں ہے ہر چند کہ سنی صاحب کا وہ مقالہ نیز وضوح
کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے پھر بھی بحث کے چند گوشے ایسے رہ گئے تھے جن کا اس
سلسلہ میں بے نقاب ہو جانا ہی بہتر تھا سنی صاحب کا مقالہ نظر سے گذرنے
کے بعد مجھے یہ آسانی ہوئی کہ بحث کے آخری حصہ میں جہاں کتب شیعہ سے استخراج و استنباط
کی ضرورت پیش آتی تھی ان میں سے ان تمام روایتوں کو ترک کر دیا تھا جو سنی صاحب
اپنے بیان میں لا چکے تھے کہ بے جا طوالت سے بچنا مقصود تھا بہر نسبت
ان جملہ مباحث کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔

کہ خلافت علی کے لئے ایک بھی نص قطعی موجود نہیں نہ رسول کی یہ
خواہش تھی بلکہ یہ بعض مفسدین کا اختراعی مسئلہ ہے اور اس قدر مہلک
خطرناک کہ اس کی بدولت قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

میں شیعی علماء سے گذارش کروں گا کہ وہ ان معروضات پر بحیثیت حق ... حیثیت سے غور کرنے
کی زحمت گوارا فرمائیں بات آسان ہے سمجھ میں آسکتی ہے بشرطیکہ تعصب و تنگ
نظری کی تاریک فضا سے علیحدہ ہو کر غور کیا جائے ورنہ ذاتی اغراض و مقاصد کا
حجاب طبیعت کو اثر پذیریوں سے مجبور رکھتا ہے اور انسان قبول صداقت کی
سعادت سے محروم رہ جاتا ہے۔

م ح

مسئلہ خلافت و امامت

انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے

...داری ۳۷ء کے نگار میں بعنوان مسئلہ ... مضمون شائع
... وہ گویا خلافت و امامت کے مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بحث
... عام ہے۔ اور نگار کے ایڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اصل
موضوع پر دونوں فریقوں کی جانب سے ایسے دلائل پیش کئے جائیں
کہ ... کس حد تک اس قدیم اور دشوار گتھی کو سلجھانے کے قابل
ہوسکے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں پہلے انسانیت
اور بعد اسلام کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس لئے
آئیے دیکھیں کہ انسانیت و اسلام کے جو اصول انھوں نے مقرر کئے
ہیں کس حد تک لائق تسلیم ہیں اور انسانیت انھیں گوارا بھی
کرتی ہے یا نہیں۔

... انسانیت کا مدار عقل جوئی پر رکھنے میں ملاحظہ ہو:-

پائی گئی کیا وہ شہنشاہیت نہ تھی؟

اب رہا نسلی امتیاز کیا میں سوال کرسکتا ہوں کہ مختلف اقوام میں اور مختلف زمانوں میں اس امتیاز کا احساس رہا ہے یا نہیں؟ اور آج بھی ہے یا نہیں؟ یہ عالمگیر احساس مجھے تو کبھی گم ہوتا نظر نہ آیا بلکہ بنی نوع انسان کی ایک وسیع جماعت ہمیشہ اس کی حمایت کرتی نظر آئی۔

یہ خیال کہ اسلام اس نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا کم از کم کلام مجید سے تو ثابت ہوتا نہیں بلکہ برخلاف اس کے اس امتیاز کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"ان اللّٰہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراھیم وآل عمران علی العالمین"

کیا اس سے آل ابراہیم اور آل عمران کا نسلی امتیاز ثابت نہیں ہوتا اس سے بھی تیز تر سنیئے:-

"ام یحسدون الناس علی ما اٰتاھم اللّٰہ من فضلہ فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واٰتیناھم ملکا عظیما فمنھم من اٰمن بہ ومنھم من صد عنہ وکفیٰ بجھنم سعیرا"

(کیا یہ لوگ ان لوگوں سے حسد رکھتے ہیں اس شے پر جو خدا نے اپنے فضل سے انھیں عطا کر دی بیشک ہم نے آل ابراہیم کو کتاب

بھی دی اور حکمت بھی اور انھیں ملک عظیم عطا کر دیا۔ اب کوئی تو اس پر ایمان لاتا ہے اور کوئی رکتا ہے اور جہنم کے شعلے اس کے لئے کافی ہیں۔

آل ابراہیم پر برکتوں کی بارش اور اس شد و مد سے کہ جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے لئے جہنم کے شعلے ہیں کس امر پر دال ہے اور کیا یہ اس امر کا متین ثبوت نہیں ہے کہ خود مشیت الٰہی نوعی اور نسلی امتیاز کی حامی ہے۔

بلا شک و شبہہ رسول اللہ کا مقصود جو اسلام بحکم دنیا کے سامنے آئے دنیا و عقبیٰ میں حسن سعادت بشری کا حصول تھا اور چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے دنیا آخرت کا مقدمہ ہے اور دین وحی الٰہی ہے اس لئے اس میں کسی انسانی مصلحت اندیشی کو دخل نہیں ہو سکتا اور اس کی تبلیغ میں ایک پیغمبر کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے لئے یا اپنی نسل کے واسطے یا اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر جائے اگرچہ دنیا یہ شبہہ کرتی ہے اور بعض نے حتماً و جزماً اس کا اعلان بھی کر دیا ہے چنانچہ یزید کہتا ہے:۔

لعبت ہاشم بالملک فلا — خبر جاء ولا وحی نزل

(ایک ہاشمی نے سلطنت کے لئے یہ کھیل کھیلا۔ حالانکہ نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی) شیعی حلقوں میں جس سلطنت اور جس حکومت

اس نبی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ وہ دنیاوی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ ایک
سعادت کبریٰ ہے جس کا راز آنحضرت کے سینے میں رکھا گیا اور جس کو
بروئے کار لانا بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ مقصد یہ تھا
کہ اس قانون کے ماتحت حیات انسانی کی تنظیم اس طرح کی جائے
کہ سعادت کا کوئی انفرادی و اجتماعی پہلو چھوٹنے نہ پائے لیکن یہ
کیفیت بالکل واضح ہے کہ کوئی قانون زیر عمل نہیں آسکتا جب
تک کہ حکومت کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو چنانچہ حضرت پیغمبر اپنے وقت
میں خود حاکم تھے لیکن یہ حکومت نہ شہنشاہیت تھی نہ اسے ڈکٹیٹرشپ
سے تعلق تھا اور نہ "جمہوریت" کی ممنون احسان تھی بلکہ فی الحقیقت یہ جلوہ
نبوت الٰہیہ کی ایک شعاع تھی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ نبوت کے دو پہلو ہیں۔
ایک یہ کہ بارگاہ الٰہی سے احکام اس کی مخلوق تک پہونچانا ہے اور دوسرا
یہ کہ اس کے اجرا کا انتظام بھی زمانہ میں۔ اس اعتبار سے جس طرح نبوت
من جانب اللہ ہے اسی طرح یہ حکومت بھی ہے اور رسول اللہ کے
بعد لامحالہ ہم کو اس کے لئے محل قابل کی تلاش کرنی پڑے گی۔
یہاں علی و عمر کی بحث نہیں ہے۔ اگر علی محل قابل ہیں تو بسر و چشم ورنہ
اور اگر عمر اس کی قابلیت رکھتے ہیں تو دل ماشاد۔ مگر اس کا ذریعہ شناخت
بھی صرف زبان وحی ہونا چاہئے جو عقل عمومی سے بہت زیادہ بلند تر۔

جائیکہ سلطان خیمہ زد غوغا نباشد عام را

ظاہر ہے کہ اس حکومت میں انتخاب کو دخل نہیں تھا بلکہ یہ عطیہ الٰہی تھی اور یہ جہاں بھی قائم ہو اس کی شان برقرار رہنی چاہئے جہاں پائی جائے من اللہ پائی جانی چاہئے اور "من اللہیت" کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف رسول ہے۔ اب اسے حکومت الٰہیہ سمجھئے خلافت الٰہیہ کہئے امامت الٰہیہ فرمایئے جو کچھ چاہے کہئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس چیز کو خود رسول بھی اپنے اختیار سے کسی کو عطا نہیں فرما سکتے تھے!

"وربک یخلق مایشاء ویختار ما کان لھم الخیرۃ"

یہ ہے وہ امامت الٰہیہ جو طبقۂ شیعہ کا مطمح نظر ہے۔ اس امامت کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ عوام بھی اس کے ساتھ رہیں اور اس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے پروپگنڈا کرے۔ اس قدر بیان سے غالباً امامت الٰہیہ کے متعلق شیعہ نظریہ واضح ہو گیا ہو گا۔

حضرات اہل سنت جن کو خلفاء کہتے ہیں ہم بھی انہیں خلفاء کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے اتفاق سے وہ خلیفہ بنے ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ وہ کتنے ہی اچھے سہی لیکن یہ تو نہیں کہا

جا سکتا کہ اُن کی حکومت حکومت الٰہیہ ہے کیونکہ اجماع و شوریٰ خود
اس کے منافی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ حضرات اہل سنت جس کو خود
حاکم بنائیں اُس کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ
اُس کا ہر قول، ہر فعل، ہر حرکت حکم خدا ہے اور یہیں سے سارا جھگڑا
پیدا ہوتا ہے۔ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم اس کو
صرف حاکم اسلامی سمجھیں گے۔ اُس کی حکومت حکومت اسلامی
کہلائیگی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے حکومت آلٰہیہ بھی تسلیم کر لیا جائے۔
الغرض! شیعہ کے نزدیک خلفا کی خلافت ایک دنیوی قسم کی حکومت
تھی اور یہی سبب ہے کہ علی مرتضیٰ کو بھی اس خلافت کے لحاظ سے جو
علی الظاہر انھیں اصول کے ماتحت انھیں ملی کوئی خاص فضیلت
حاصل نہیں ہوئی، وہ اس خلافت کے باعث عالم تشیع میں روشناس
نہیں ہوئے۔ اگر یہ چند روزہ حکومت نہ ہوتی تو بھی علی بہ حال علی رہ
سکتے تھے۔

فاضل مضمون نگار نے صفحہ ۶ پر جو تنقیحات قائم فرمائی ہیں اگرچہ
وہ بہت کچھ بحث طلب بلکہ اصلاح طلب ہیں لیکن اُن سے اور بعد کی
تشریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کے نزدیک اداء دینی میں خلافت
کا منصوص ہونا دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہے لیکن حق تلفی کا سوال

اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب دو برابر کے حق داروں میں سے کسی ایک کا حق غصب کیا جائے یا کسی زیادہ مستحق شخص کے مقابلہ میں کم استحقاق رکھنے والے کو ترجیح دی جائے۔ لیکن چونکہ "امامت الٰہیہ" کا تعلق اکتسابات دنیاوی سے نہیں ہے جن میں فرق و امتیاز کا پایا جانا ضروری ہے بلکہ محض منشاء خداوندی سے ہے اس لئے اگر اس کے صحیح مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ:۔

"خداوند عالم طے کر چکا ہے کہ رسول کریم کے بعد خلافت الٰہیہ علی ہی کے لئے ہے اور علی کے بعد اس کے گیارہ فرزندوں کے لئے"

تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ ہاں یہ خیال دماغ سے نکل جانا چاہئے کہ یہ عطیہ ان لوگوں کے لئے اولاد رسول ہونے کی حیثیت سے ملا ہے یا رسول یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہے، کیونکہ اگر اولاد رسول ہونے کی حیثیت مدنظر ہوتی تو خود علی کو یہ شے کیسے ملتی اور اگر اولاد علی کا لحاظ کیا جائے تو علی مرتضیٰ کی اولاد دوسری بی بیوں سے بھی ہے یہ منصب وہاں کیوں نہ پہونچا اور اگر بنو فاطمہ کا لحاظ کیا جائے تو اولاد امام حسن اس سے کیوں محروم رہی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسبی امتیاز کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

نوع انسان میں آدم سے لے کر آج تک بیشمار انسان گذرے ہیں لیکن ان لاتعداد انسانوں میں سے صرف چند منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اس کے کیا معنی؟ یہاں بھی یہ حق تلفی نظر آتی ہے۔

نقل کا جواب اس مقام پر یہ ہے کہ غصب حقوق کا اطلاق وہاں ہوا کرتا ہے جہاں کوئی حق پایا بھی جائے اور جب حق کا وجود ہی نہ ہو تو غصب حقوق لعنی چہ؟

میں اس تحریر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس منصب جلیل کو مقرر کرنے کا اختیار خود رسول کو بھی نہیں تھا ہاں اعلان ان کے فرائض تبلیغ میں ضرور تھا اور یہ اعلان بطریق شیعہ بذریعہ اہل بیت علی التواتر ثابت ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے طعنا لکھا ہے کہ شیعہ تمام دنیا کی آبادی میں دس فیصدی بھی نہیں ہیں۔ اگر یہ تحقیق صحیح مان لی جائے تو بھی دس فیصدی بہت ہیں کیونکہ جس فرقہ پر صدیوں تک تلوار چلی ہو اور چل رہی ہو اس کا صفحہ عالم پر باقی رہ جانا ہی حیرتناک امر ہے۔ بہرحال وہ جتنے بھی ہیں شرفا ہیں اس لئے کہ عوام الناس مصائب میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام دنیوی زحمتوں کو قبول کیوں کیا؟ کیا ان کے لئے حلوے مانڈے

میں منضم ہو جانا ممکن نہ تھا یقیناً تھا۔ لیکن ان کی نظر مادّی فوائد پر نہیں تھی بلکہ وہ دینِ صحیح اور اسلامِ صحیح کے طلبگار تھے اور ان کے نزدیک اسلامِ صحیح کی حامل دوسری ہستیاں تھیں۔ لہذا اُنھوں نے حکامِ وقت کے مظالم سہے مگر ان کا دامن نہ چھوڑا۔

خوجہ اور بوہرہ حضرات کے مرشدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام اولادِ علی کو جو صاحبِ مضمون نے خلافت آلٰہیہ کا مرکز بنایا ہے یہ محض ایجاد بندہ ہے۔ اسی طرح آغاخاں اور ملا طاہر سیف الدین کی تعلیم جو کچھ ہو۔ عقیدہ خلافت آلٰہیہ اس کا ذمہ دار نہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ اسمٰعیلیہ کے ظہور کا سبب کیا ہے؟ ناظرین غور فرمائیں کہ روس میں بالشوزم کی بنیاد کیوں پڑی؟ ظاہر ہے کہ شاہانِ روس کے مظالم بالشوزم کے ظہور میں آنے کا سبب ہیں۔ اگر عوام امن و سکون کی زندگی بسر کریں مظلوم کو ظالم کی طرف سے کھٹکا نہ ہو۔ عدالتِ صحیحہ کا دور دورہ ہو تو بغاوت کے جراثیم پیدا ہی نہیں ہوتے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ابن آدم کا فطرتی حق ہے کہ امن و آزادی کی تدبیریں سوچے۔ اب اُس وقت کی اسلامی حکومتوں پر نظر کیجیئے۔ ظاہر ہے کہ وہ منصوص من اللہ تو تھیں نہیں اور ظلم و استبداد دنیا میں پھیل رہا تھا اس لیئے ایک جماعت نے

ان سے گلو خلاصی کی کوشش کی۔

وہ ہستیاں جو منصوص من اللہ تھیں انھوں نے تو ہمیشہ صبر و سکوت کا حکم دیا نہ خود ان امور میں حصہ لیا اور نہ کسی کو اجازت دی لیکن یہ صبر نہ ملو نیچھ کا حصہ نہیں ہوتا جس کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا تھا وہ حکومت کے خلاف اٹھتا تھا اور اپنی جان دیتا تھا۔ علویین، سلاطین وقت کے خلاف اٹھے اس کا راز یہی ہے اور اس معاملہ میں وہ قطعاً معذور تھے۔ چنانچہ زید بن علی اسی جذبہ کے تحت حکومت کے خلاف میدان میں آگئے اور حضرت ابو حنیفہ گویا ان کے خاص معاونین میں سے تھے (اگرچہ انھوں نے عین وقت پر عذر کر دیا) ائمہ اہل بیت جو ان حضرت کو روکتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی حقیقت بین نگاہیں انجام کو جانتی تھیں۔

سب جانتے ہیں کہ جب دنیا سے حق و ناحق کا امتیاز اٹھ جاتا ہے تو ہر نوع کا انتشار و اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ان موقعوں پر بھی ہوا وہ لوگ جو ان سلطنتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کی نظر میں علویین اور فاطمیین کی ناکامیاں بھی تھیں اور سے ایک نئی اور کامیاب ذریعہ کی جستجو کر رہے تھے پھر چونکہ ہر ناکامی انسان کے لئے سبق ہے کامیابی کا لہٰذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بنو علی و

نو فاطمہ جو ناکام رہتے ہیں اس کا سبب ہی ہے کہ ان حضرات میں سب
اوصاف سہی لیکن قیادت مذہبی انھیں حاصل نہیں اور جن بزرگواروں
کو نیچے مذہبی عظمت حاصل ہے وہ اس میں شرکت نہیں کرتے اور انکی
عدم شرکت کے راز سے سب آگاہ ہیں اس لئے ملک کو کوئی دلچسپی ان
سے نہیں رہتی اور حکومت بآسانی مقابل آنے والوں کو زیر کر لیتی ہے۔
فکر کرنے والوں کے سامنے جب کوئی ایسا سبب آجاتا ہے
جو ان کے ارادوں میں حائل ہو تو وہ اس کے دور کرنے کی فکر کیا ہی
کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عزم کر لیا گیا کہ ایک مذہبی مسند الگ قائم کی جائے
تاکہ قائد کا وقار مذہبی حیثیت سے بھی مسلم ہو۔ چنانچہ اسی خیال کے
تحت اس تجویز کو عمل میں لایا گیا اور آخر ایسی کامیابی ہوئی کہ بڑی
بڑی تمام خلافتوں کے بنائے کچھ نہ بن سکی فرقہ باطنیہ کی بنیاد
قائم ہوئی جس کے ہاتھوں بڑے بڑے حکام قتل ہوئے۔ اب
انھیں کوسا جاتا ہے لیکن بالشویکوں نے روس کے شاہی خاندان
کا چن چن کے خاتمہ کیا تو اس پر کسی نے آہ بھی نہ کی بلکہ اشتراکیت
کو سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ جس روح کے تحت زار روس تباہ ہوا
اسی کی بنا پر بڑے بڑے ملا قتل ہوئے جو فی الحقیقت عوام کو
قابو میں رکھنے کے لئے ظالمانہ حکومتوں کے ایجنٹ تھے۔

اہل نظر انصاف فرمائیں کہ ایسے فرقوں کی پیدائش کا سبب ظالمانہ حکومتیں ہیں یا عقیدۂ خلافت الٰہیہ۔

مزید توضیح ملاحظہ، اہل سنت کے پاس انعقاد خلافت کے چار طریقے ہیں:-

(۱) اجماع یعنی ایک ہمخیال گروہ کا مل جل کر کسی کو حاکم بنا لینا ہم خیال اس لئے کہتا ہوں کہ آزاد و واقعی اجماع محض نہیں۔

(۲) استخلاف یعنی جانے والا کسی کے لئے کہہ جائے کہ یہ میرا جانشین ہے۔

(۳) شوریٰ یعنی ایک محدود جماعت کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا۔

(۴) غلبہ یعنی جس کے ہاتھ میں بھی تلوار آجائے اور سلطنت حاصل کرلے۔

در اصل جامعیت اسی کا نام ہے یعنی جتنے طریقے بھی حکومت کے ہو سکتے ہیں وہ سب گھیر لائے گئے ہیں کسی قسم کی بھی حکومت ہو وہ ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جب جن صورتوں سے حکومتوں کا ظہور ہوا ان سب کو حق بنانے کے لئے یہ اصول تصنیف کئے گئے ہیں۔ گویا حکومتیں کسی اصول کے تحت

نہیں بلکہ اصول حکومت کے تحت ہیں۔

یہاں تک غنیمت ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور ان کی بیعت سے تقاعد کرنے والا مستوجب جہنم۔ چنانچہ ایسے ہی موقعوں کے لئے یہ حدیث پیش کی گئی ہے:۔

"من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃً جاھلیۃ"

صاحبان غور و فکر سے التماس ہے کہ طرق چارگانہ جو بیان کئے گئے وہ اصل میں تین ہی ہیں۔ اس لئے کہ اجماع و قوعی و شوریٰ کی روح ایک ہی ہے اور یہ تینوں طریقے بلا شبہہ متضاد ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں اسلامی طریقہ کون سا ہے؟ اگر یہ سب کسی اسلامی حکم کے تحت ہیں تو معاف کیجئے ایک اہم اور اصولی مسئلہ میں ایسے متضاد احکام! عقلاً ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام کرنا چاہئے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کے آخر میں اپنی تحریر کا خلاصہ درج کر دوں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) اسلام بلا شک و شبہہ سعادت بشر کے لئے آیا ہے۔

(۲) اسی سعادت کا ایک جزو خلافت الٰہیہ ہے۔

(۳) خلافت الٰہیہ ایک موہبت الٰہیہ ہے۔ وہ کسی نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ جوہر ذاتی کی بنا پر ہے کسی ایک نسل میں اس کا پایا جانا اس مفہوم کا حامل نہیں کہ نسلی امتیاز مدنظر رکھا گیا ہے۔

(۴) خلافت الٰہیہ کے کسی فرد یا جماعت کی حق تلفی کا ذکر ایک دھوکا ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ فلاں شخص یا فلاں خاندان اس عطا کا مستحق تھا۔ بغیر اثبات حقوق کے غصب حقوق کہنا ایک بے معنی بات ہے۔

(۵) اگر غیر مستحق مدعیان امامت پیدا ہوئے تو امامت الٰہیہ اس کی ذمّہ دار نہیں۔

(۶) عقل عمومی کی حجت کا دعویٰ غلط ہے

یہاں تک انسانیت مفروضہ کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب قرآن و احادیث کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

شیعہ اور سنیوں میں ایک اصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ شیعہ مسئلہ کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے حضرات اہل سنت کا مسلک دوسرا ہے۔ چنانچہ اسی تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محرر کے نزدیک "انسانیت" اور شے ہے اور "اسلام" اور شے۔

مسئلہ قرآن میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطالب صاف وصریح سمجھ میں بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ ملاحظہ کیجئے یہ کتاب خود اپنے متعلق کیا کہتی ہے۔

"فیہ آیات محکمات ھن ام الکتاب و اخر متشابہات"

اس میں بعض آیات محکمات ہیں اور دوسری متشابہات ہیں اور خود قرآن یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت محکم ہے اور فلاں متشابہ۔

اس کتاب میں اجمال بھی ہے مثلاً اقیموا الصلٰوۃ و اٰتوا الزکوٰۃ لغت کے لحاظ سے دیکھو تو صلٰوۃ کے معنی دعا اور زکوٰۃ کے معنی نمو۔ قرآن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ صلٰوۃ سے مراد وہ عبادت ہے جس کے اجزائے ترکیبی قیام، رکوع، سجود، تشہد وغیرہ ہیں یا زکوٰۃ سے مراد وہ خیرات ہے جو مذہبی فرض کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ان اللہ اصطفیٰ اٰدم و نوحا و اٰل ابراہیم (خود قرآن کچھ نہیں بتاتا کہ آل ابراہیم سے مراد کل ہیں یا بعض)

دوسری جگہ فرمایا:-

"یقول الذین کفروا لست مرسلا قل کفیٰ باللہ شھیدا بینی وبینکم ومن عندہ علم الکتاب"

کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے۔ کہدے میرے اور تمہارے

درمیان شہادت دینے کے لئے خدا کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے۔ یہ صاحب علم الکتاب کون ہے؟ قرآن بظاہر خاموش ہے۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو:۔

"انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون"

یہ قرآن کریم ہے جو کتاب مکنون میں ہے اسے مس نہیں کریں گے مگر مطہر وہ کتاب مکنون کیا ہے جو ظرف قرآن ہے؟

یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ ایک ایک قدم پر بھی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ مشکلات تو تفسیر کی حد تک ہیں۔ اب رہی تاویل وہ تو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔

آیات قرآنی کے سلسلہ میں اعتراضاً تحریر فرمایا گیا ہے کہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں استاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقے نے کھولا ہے اور حاشیہ پر پروفیسر نکلسن کی کتاب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔

پہلے تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تاویل کے معنی کسی لفظ کو اس کی حقیقت اولیہ کی طرف پلٹانا۔ چنانچہ بعض مقام پر یہی

حقیقت اولیہ مراد لی جاتی ہے اور ظاہر لفظ کا کوئی خیال نہیں رکھا
جاتا اور بعض مقامات پہ حقیقت اولیہ بھی مدنظر رکھی جاتی ہے اور
ظاہر معنی بھی۔

مثلاً "ید اللہ فوق ایدیھم" اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے
معلوم ہے کہ "ید" یا "ہاتھ" سے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے
اس لئے یہاں "قوت و قدرت و گرفت" کے معنی مراد لئے جائیں گے
اور ظاہر معنی کا قطعاً لحاظ نہ ہوگا۔

مثال ۲۔ "اقیموا الصلوٰۃ" ظاہر ہے کہ نماز کی حقیقت اولیہ رجوع
الی اللہ ہے اب یہ معنی بھی ملحوظ رہیں گے اور اس کے مفہوم ظاہری کا
بھی لحاظ رکھا جائیگا جو شارع علیہ السلام نے متعین فرما دیا ہے کیونکہ
بعض ارکان کے خلاف کوئی دلیل عقلی یا نقلی موجود نہیں ہے۔ بلکہ
بالتواتر یہی اصول عبادت تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ہیں تاویل کے
معنی جو عرض کئے گئے اب اگر اس قسم کی تاویل کا دروازہ شیعوں
نے کھولا ہے تو وہ اولو الالباب ہیں۔ صاحب فہم و فراست ہیں لیکن
اگر فاضل مضمون نگار اپنے خیال میں تاویل کے معنی یہ سمجھ رہے ہیں
کہ اصل مفہوم و منشاء کو کھینچ تان کر کچھ سے کچھ بنا دینا تو اس کی
تفصیل آئندہ اوراق میں آئیگی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ

مطالب قرآنی ہر عامی انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسی لئے اسکے معلم اول خود رسول اللہ تھے مسلمان مجبور تھے کہ وقت نزول آیت رسول اللہ سے اس کا مطلب دریافت کریں، دریافت کرتے تھے اور جواب پاتے تھے۔ انھیں جوابات کو تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان تفسیر کو چھوڑ کر قرآن کو کافی سمجھنا یا خود اس کے مفہوم متعین کرنا رسول کے مرتبۂ معلمیت سے انکار کرنا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے؟ آیا تفسیر سے ہاتھ اٹھالیں یا اس پر عمل کریں؟ اور اگر عمل کریں تو کس کے توسط سے؟ شیعہ دوسری صورت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور توسط کے معاملہ میں ان کی نگاہ اہلبیت پر جمی ہوئی ہے۔ مطالب قرآنی کے متعلق یہ ہے شیعی نقطۂ نگاہ۔ اب میں قایل کی قرآن فہمی پر نظر کرونگا ابتدائے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں۔

"وہ قرآنی آیات جن کی بنا پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علی کی الوہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں۔"

اس تحریر سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف اتنی ہی آیتیں مدار مذہب شیعہ ہیں۔ خیر آیئے مطلب کی طرف۔

"انّ لیس البرّ بان تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البرّ من اتقی واتوا البیوت من ابوابھا"

نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو۔ تفسیر آیت یہ ہے کہ بزمانہ جاہلیت عرب جب حالت احرام میں ہوتے تھے تو دروازوں سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پشت خانہ میں کھڑکی سی بنا لیتے تھے اسی میں سے آتے جاتے تھے اور اسے جزو دین سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعہ اس رسم پرستی کی ممانعت کر دی۔

یہ تو وہ حقیقی مفہوم ہوا جو الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جو اس آیت کی شان نزول پر مبنی ہے لیکن ذرا نظر کو وسعت دیجئے احکام قرآنی کسی خاص مسئلہ سے متعلق صادر تو ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں اس قسم کے سارے واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو قوانین اسلامی محض مقام فرمان ہو کر رہ جائیں گے اس لئے یہ ماننا پڑیگا کہ اس حکم میں سیدھا راستہ چلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کجروی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ آیت کی تاویل غلط ہے یا صحیح۔ تاویل یہ ہے کہ

ہر فن میں ہر علم میں، ہر مسئلہ میں اسی قاعدہ سے داخل ہونا چاہئے جو اس کے لئے معین و مقرر ہے۔ اگر عقب سے آؤ گے یعنی خلاف قاعدہ داخل ہو گے تو کچھ استفادہ نہ کر سکو گے۔ یہ ایک سیدھا سا عقلی اصول ہے اور اسی آیت کے تحت میں آرہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر فن میں داخل ہونے کے لئے اس شخص کے پاس جانا چاہئے جو اس فن کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسی عقلی اصول کی بناء پر نحو کا دروازہ نحوی ہے اور راگ کا دروازہ گویا۔ نحو سیکھنے کے لئے نحوی کے پاس جائیے۔ اور راگ سیکھنے کے لئے گویئے کے پاس۔ اسی طرح خدا شناسی کا ذوق ہے تو رسول کے پاس جا۔ کیونکہ معرفت الٰہی کا دروازہ رسول ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ علم رسول کا دروازہ کون ہے۔ یعنی علم رسول کا باب تو ضرور ہونا چاہئے مگر وہ ایسا کون ہے جو در حقیقت سے واقف علم رسول ہو۔ شیعہ یہاں تک تو صرف بحکم عقل آتا ہے اور جب تلاش کا قدم بڑھتا ہے تو اس کی خوش قسمتی سے ارشاد رسول اس کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے کہ "انا مدینۃ العلم و علی بابھا"۔

اب اس شناخت کے بعد اس کی نظر اس ارشاد الٰہی پر جاتی ہے۔

"ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر

اولوا الالباب"

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اس استدلال میں کیا خرابی ہے اور

آپ ہی متعین کیجئے کہ آخر عالم علم رسول کما حقہ کون ہے؟

(۲) الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و

رضیت لکم الاسلام دینا"

ترجمہ آج میں نے تمھارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان

کو تم پر پورا کر دیا (نعمت کا ترجمہ احسان کیا خوب) اور میں نے پسند

کیا کہ تمھارا دین اسلام ہو)

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آیت

میں کونسا خلا یا نقص ہے جو حدیث غدیر کے ضم کرنے کی ضرورت

ہوئی"

بے شک ذرا دور کی بات ہے۔ اس مقام پر کچھ کسی قدر

تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ "الیوم" میں "الف" "لام" "یوم" کا نمایاں ہے

یہ "الف" "لام" "یوم" کو جو نکرہ ہے معرفہ بنا رہا ہے، اسی لیے اسکا ترجمہ

"آج" کیا گیا، مگر میں ترجمہ کرتا ہوں "آج" کا دن "کہ اصل لفظ کی قوت اسی میں باقی

رہتی ہے ۔ الغرض الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن کوئی مخصوص دن ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ وہ روز مخصوص کون سا ہے۔ فرض کیجئے ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے اور جب اس پروگرام کا جزو اخیر انجام پا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے دن ہم نے اس پروگرام سے فراغت پائی۔ یا آج کے دن ہم نے اس کی تکمیل کرا دی۔ ہاں یہ واضح رہے کہ پروگرام کی تکمیل کے پانچ دس دن بعد بلکہ اس کے دوسرے ہی دن " الیوم " کہنا درست نہ ہوگا۔ اسی طرح سے آیندہ مذکور میں نہ صرف یوم مخصوص بلکہ نبوت کے پروگرام کے جزو اخیر کی شناخت بھی ہو رہی ہے۔ اس کو خلا یا نقص نہیں کہتے بلکہ اسے " دعوت تفکر " کہتے ہیں۔

یہ ارشاد کہ " رسول کریم نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرمایا " کچھ مفید نہیں ہے اسی کو تعریف المجہول بالمجہول کہتے ہیں۔

لفظ مولیٰ سے جو تعرض کیا گیا ہے۔ میں اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب کچھ کہا جائے تو کس کے سامنے

(۳) " [illegible]

ترجمہ۔ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو تنبیہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں اُن کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی اُن کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

اب سوال یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل رسول اللہ نے کی یا نہیں؟ اگر کی تو کیا کوئی عنوان خاص اختیار کیا یا ویسے ہی عام طور پہ کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ آخر تاریخی حیثیت واقعہ کی کیا ہے فاضل مضمون نگار نے اس مقام پر وعدہ کیا تھا کہ "بیت عشیرہ کے واقعہ پر بحث احادیث میں روشنی ڈالی جائیگی۔ مگر تمام بحث احادیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا گویا پی گئے۔ اگر ڈپٹی نذیر احمد مرحوم زندہ ہوتے تو اس موقع پر ضرور لکھ دیتے کہ "معلوم ہوا پانی مرتا ہے"۔

(۴) انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون

(ترجمہ۔ تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اُس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور عجز و انکسار سے زندگی گذارتے ہیں (راکعون کا ترجمہ "رکوع" نہیں کیا گیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی کے لئے کوئی ایسی صورت ... پیدا

ہو جائے اور اُسے کسی کی ولایت میں آنا پڑے تو وہاں ولی کے کیا معنی ہونگے۔

اب دوسرے پہلو کو دیکھئے " وهم راكعون " کا ترجمہ فرمایا گیا ہے " اور عجز و انکسار سے زندگی گذارتے ہیں "۔ اب میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ " واو " کو " عاطفہ " نہیں " حالیہ " قرار دیتا ہوں اور کہتا ہوں " وہ زکوٰۃ دیتے ہیں درانحالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں "۔ کون سا قانون عربیت اس ترجمہ سے روک سکتا ہے اس طرح اس آیت کے دو ترجمے ہوگئے۔ ایک وہ جو صاحب مضمون نے کیا ہے۔ دوسرا یہ جو میرے قلم سے نکلا ہے ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ایک ایسا معیار ہو جس کی طرف دونوں رجوع کرکے فیصلہ کرسکیں اگر کوئی معیار نہیں ہے تو پھر معاملہ یوں ہی مبہم کا مبہم رہیگا۔

اب میں از روئے مفہوم اس آیت کو سمجھنا چاہتا ہوں مفہوم اولین یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک گروہ تو " ولی " کا ہے جس کا سلسلہ خود ذات باری سے [illegible] " کی مناسبت سے [illegible] اللہ و رسولہ [illegible] ان صفات والے لوگ [illegible] اب دیکھنا [illegible]

وہ کون لوگ ہیں جن پہ یہ مقرر ہوئی ہے ان کا یقین کئے
بغیر آیت تشنۂ مفہوم ہی رہے گی۔

دوسری لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ "اولیا" کا طبقہ
الگ ہے اور "مولی علیہم" کا طبقہ الگ اور طبقہ اول میں لازماً
کچھ ایسی صفات ہیں جو انھیں دوسرے طبقہ سے ممتاز کر رہی ہیں
ورنہ ایک جماعت کو ولی قرار دینا اور دوسری کو "مولی علیہم"
ایک بے معنی بات ہے۔ یہ ماننا پڑیگا کہ طبقہ ثانی میں وہ
صفات نہیں ہیں جن کا طبقہ اولیٰ حامل ہے

اب بحکم عقل سلیم واجب ہے کہ "وجہ امتیاز" کی تلاش کی جائے
اور وہ ایسی شئے ہو کہ دوسروں میں نہ پائی جا سکے۔ دیکھیے
"الذین امنوا" سے کچھ بھید نہیں کھلتا۔ اس لئے کہ ایمان ایک
شئے مشترک ہے جو کم و بیش ہر مخاطب میں موجود ہے۔ اسی طرح
"یقیمون الصلوٰۃ" بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ سب ہی نماز
پڑھتے ہیں۔ علیٰ ہذا "یؤتون الزکوٰۃ" والے زکوٰۃ سے بھی کوئی
خصوصیت خاصہ ظاہر نہیں ہوتی۔

اس لیے جب بعضوں کے ترجمہ کی بنا پر اس آیت کا
کوئی واضح مطلب نہیں ہوتا اور نہ کوئی وجہ امتیاز معلوم ہوتی ہے

بسبیل تنزل زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مفہوم پیدا کریں تو یہی ہوگا
کہ جن کا ایمان اعلیٰ درجہ کا ہے جو انتہائی خضوع و خشوع سے ہمیشہ
نماز پڑھتے ہیں جو برابر زکوٰۃ دیتے ہیں جو ہمیشہ خضوع و خشوع سے
زندگی گذارتے ہیں۔ یہ لوگ ولی ہیں۔ ان لوگوں کے جن کا ایمان
ادنیٰ درجہ کا ہے یا صرف زبانی ہے۔ لیکن مفہوم پھر بھی مبہم کا
مبہم رہ جاتا ہے۔ بتایا جائے وہ بڑے ایماندار کون ہیں جو کمزور
ایمان والوں کے رفیق ہیں؟ پھر یہ بھی ہو کہ ایمان کی کمی و بیشی ایک امر
باطنی ہے۔ اسی طرح خضوع و خشوع فی الصلوٰۃ ان امور کا کون
اندازہ لگائے؟ غرض اس مفہوم کی بنا پر بھی انسان کسی نتیجہ تک
نہیں پہنچ سکتا اور فاضل مضمون نگار نے جو ترجمہ پیش کیا
ہے اُس کی بنا پر آیت گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہے۔

برخلاف ازیں دوسرا ترجمہ "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں درانحالیکہ رکوع
میں ہوتے ہیں" ایک نہایت صاف و صریح وجہ امتیاز ہے اور
یہ شان امتیازی جہاں پائی جائیگی وہیں ولایت متحقق ہو جائیگی۔
اس بات کی پرواہ نہیں کہ یہ "امتیاز" کہاں پایا جاتا ہے؟ ہمیں
اصرار نہیں کہ علی ہی اس کے حامل ہیں یا نہیں۔ جب کہ یہ ثابت
ہو جائے فرد بغیر ثابت کردینا قبول۔ لیکن محض اب ...

کرتے ہیں۔ شان امتیاز پائی جاتی ہے۔ مفہوم آیت کو بدلنے کی سعی
اکابر علما کا کام نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ولی کا ترجمہ "رفیق" کس بنا پر فرمایا
گیا ہے۔ آیا ولی رفیق مترادف الفاظ ہیں؟ یا لفظ ولایت مشترک
ہے اگر مشترک ہے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص کرنے کیلیے قرینہ کی
ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً لفظ "عین" کہ سورج کے معنی بھی دیتا
ہے اور چشمہ کو بھی "عین" کہتے ہیں۔ "آنکھ" کے لیے بھی مستعمل ہے
پس جب تک کوئی قرینہ نہ پایا جائے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص
نہیں ہو سکتا اب بتایا جائے کہ اس آیت میں کون سا قرینہ تھا
جس کی بنا پر ولی کے معنی "رفیق" کر لئے گئے۔

د یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان
لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس"

ترجمہ: اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دے جو تیرے
رب کی طرف سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے
کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کریگا
اس آیت کے متعلق خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ مفہوم آیت بجائے
خود مستقل ہے۔ شان نزول دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

آئیے اس کا امتحان کریں۔ مفہوم اولین کے لحاظ سے آیت
میں جو پہلو نکلتے ہیں۔ قابل ملاحظہ ہیں۔

(۱) "ما انزل الیک" جو تیری طرف نازل کیا جا چکا" اس سے
یہ مفہوم نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ نازل شدہ شے ایک ہی یا کئی ہیں
مثلاً زید عمرو سے کہتا ہے: "افعل ما قلت لک" وہ کر جو تجھ سے کہہ چکا ہوں
ضروری ہے کہ متکلم اور مخاطب کے ذہن میں تو وہ مفہوم موجود ہو لیکن
سننے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ حتماً کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک کام ہے یا
کئی کام ہیں۔ پس "ما" کا ترجمہ جو "وہ چیز ہے" کیا گیا کس دلیل سے؟
یہ ہے پہلے ہی قدم پر لغزش۔

(۲) اس آیت میں ایک ایسی تاکیدی شان ہے جو تہدید کی
حد تک پہنچی ہوئی ہے۔

(۳) وعدۂ حفاظت بھی بتا رہا ہے کہ اس میں لوگوں
کی طرف سے خوف بھی ہے۔

(۴) ضروری بات ہے کہ وہ شے جس کی بابت اس شدومد
سے حکم تبلیغ ملا ہے۔ وہ پہلے نازل ہو چکی ہو اور رسول نے دبا رکھا ہو
جیسا کہ مثال میں اشارہ کیا گیا۔

جب تک ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لایا جائے [illegible]

ہے کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ ہاں مکمل ہے مگر ان عقدوں کے کھل جانے
تک ہے۔ بغیر ان پہلوؤں کو روشن کئے یہ کہتے ہوئے چل دینا کہ مفہوم
بجائے خود مکمل ہے بحث تو نہ ہوئی ۔ دامن چھڑانا ہوا۔

یہی مشکلات ہیں جو انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شان نزول
کی طرف رجوع کرے اور شان نزول کو دیکھ کر جو مطالب پیدا ہوں
انھیں پیش کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اس
صورت میں قرآن سے استدلال نہ ہوگا بلکہ شان نزول یا حدیث
سے استدلال رہ جائیگا۔ کیونکہ جس طرح صرف ۔ نحو ۔ معانی ۔ بیان
کی قرآن فہمی کے لئے ضرورت ہے اسی طرح شان نزول ۔ تاریخ
حدیث کی بھی ضرورت ہے ۔ یہ سب قرآن فہمی کے ذرائع اور
وسائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بہ لحاظ علم معانی و بیان قرآن سے
استدلال کرے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ شخص قرآن سے نہیں
بلکہ معانی و بیان سے استدلال کر رہا ہے ۔

بحث آیات ختم ہو رہی ہے اور اس اختتام پہ مجھے کہنا پڑتا
ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس بحث میں قطعاً کامیابی حاصل
نہیں کی ۔ سطحی باتوں سے دل بہلانا چاہا ہے ۔ ان سے صاحب
فکر و نظر کے سامنے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا ۔ آیات کی

بحث ختم ہوگئی اور مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاحب مضمون نے جس تفصیل آیات کو نفس واقعی تاویل سمجھا ہے وہ تاویل ہے یا حقیقت۔ اس بحث میں میری جانب سے صرف اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ جو مغالطہ ذہنی مضمون نگار کو ہوا ہے اور مغالطہ منطقی اُنھوں نے دینا چاہا ہے۔ اس کی اصلاح ہوجائے ورنہ ان آیات کے رموز و اسرار پر ابھی بحث و گفتگو کی بہت گنجائش ہے۔

فاضل مضمون نگار کے قلم سے تحریف قرآن کے متعلق شیعوں پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اب میں اُس کی تحقیق پر توجہ کرتا ہوں۔

ان کا قیاس ہے کہ شیعہ حضرات جب قرآن سے عقیدۂ خلافت الٰہیہ ثابت نہ کر سکے تو تحریف قرآن کی آڑ پکڑی اور شیعی مجتہدین نے اپنے مشکک مریدوں کو یہ کہکر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سنیوں نے وہ آیات حذف کر دیں جن میں بالنص صریح امامت کے متعلق احکام مذکور تھے۔

لیکن فاضل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ عام طور پر شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں (شکریہ) پھر جب شیعوں کی عمومی حالت معلوم ہوگئی تو تحریف قرآن کا ذکر نہ جانے کس قسم کی خلق سے

طبعاً سوال ہوتا ہے کہ شیعوں میں تو روایات تحریف کی بنا
پر مشکک مریدوں کو تسلی دی گئی لیکن کتب سنیہ میں جو ان کا طومار
پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے۔ کبھی اس طرف توجہ فرمائی گئی ہے۔
ہاں میں عرض کرتا ہوں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جامعین قرآن نے اس ترتیب کو باقی
نہیں رکھا جو ہونی چاہئے تھی۔ پھر جن جن ترکیبوں سے قرآن جمع ہوا
ہے وہ ترکیبیں بھی سامنے موجود ہیں۔ عہد ثالث میں جو قرآن جلائے
گئے وہ تاریخ کے ایک معمولی متعلم سے بھی مخفی نہیں ان کے جلانے کی
اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو پسند
نہ کرتے تھے اور موجودہ ترتیب کے حامی تھے۔ پھر میں ارباب عقل سے پوچھتا
ہوں کہ ایک آیت کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ دی جائے اور دوسری
آیت اس کے مقام میں آجائے۔ کیا اسے "یحرفون الکلم عن مواضعہ"
(وہ کلمات کو ان کے مقام سے تحریف کرتے ہیں) نہیں کہہ سکتے۔

اب یہ اعتراض باقی ہے کہ "عقیدہ خلافت آئمہ قرآن میں بالتصریح
مذکور نہیں" میں نہیں سمجھ سکا کہ صراحت سے کیا مراد ہے۔ کیا اس سے
یہ مراد ہے کہ علی کا نام صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوا۔ لیکن ادنیٰ
غور سے یہ معمہ حل ہو سکتا ہے کہ دعوت قرآن، صاحب عقل اور

صاحب تفکر کے لئے ہے۔

نام اگر صراحت کے ساتھ ہوتا تو اسی طرح ہو سکتا تھا کہ "اے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ علی ہے" لیکن اس کی کیا ضمانت کہ لوگ اس قول پر سکوت کر لیتے۔ نہایت آسان امر تھا یہ کہنا کہ "علی" نام نہیں ہے بلکہ خلیفہ کی صفت ہے۔ یعنی اے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ بلند مرتبہ والا ہے۔

تعجب نہ کیجئے۔ حدیث مدینہ مشہور حدیث ہے۔ محدثین اہل سنت اس حدیث کو باب فضائل علوی میں نقل کرتے ہیں۔ مگر آج اس کے معنی نکالے جاتے ہیں کہ "میں شہر علم ہوں جس کا دروازہ بلند ہو"

اگر اسم علی اس حیثیت سے درج قرآن ہوتا یقیناً یہی شبہ ہوتا ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ائمہ کے نام کھلم کھلا درج کئے جاتے مثلاً "ثم الحسن ثم الحسین" اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ قرآن ہے جس کا نام حکما کی اصطلاح میں عقل اجمالی ہے اور صاحبان عقل وہ ہیں جو اجمال میں تفصیل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

عام فہم اور سادہ زبان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کی بنیاد ایجاز و اختصار پر رکھی گئی ہے۔ اور یہی اس کا حسن ہے اگر اسی طرح نام درج کئے جاتے تو اچھا خاصہ شجرہ بن جاتا۔ اس ایجاز کی منافی

قرآن میں کافی موجود ہیں۔ مثلاً خدا نے اصطفائے آل ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) تنہا بنو اسحق مراد ہیں؟ اور پھر نہیں بھی کل یا بعض؟

(۲) فقط بنو اسمعیل مراد ہیں؟ اور وہ بھی کلاً یا بعضاً؟

(۳) دونوں مراد ہیں؟ اور پھر بحیثیت کل یا بحیثیت بعض؟

پس ان سوالات کا سمجھنا اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے اسی طرح قرآن نے بیان کر دیا " اہل البیت " اب یہ معلوم کرنا ہمارا ذریعہ ہے کہ اہل بیت مطہرین کون ہیں؟۔

الغرض تصریح و صراحت کے متعلق جو شکوک پیش کئے جاتے ہیں وہ اہل عقل کے لئے قابل توجہ نہیں ہیں۔ آخر میں ایک اور مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسکو ختم کیا جاتا ہے یہ معلوم ہے کہ حضرات اہل سنت نہایت اطمینان سے فتویٰ دیتے ہیں کہ شیعوں کے پاس خلافت آئمہ کے لئے کوئی قرانی دلیل نہیں ہے۔ مگر اچھا ہے کہ شیعوں کو اُن کی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن ان حضرات نے کبھی خلافت اجماعی و شوریٰ پر بھی نظر ڈالی ہے کہ یہ طریقۂ خلافت اصول قرآنی کے مطابق ہے یا نہیں۔

اہل سنت کے پاس اس بارے میں ایک آیت ہے جس سے وہ

تمسک کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی

" وامرھم شوریٰ بینھم"

مشورہ کے بہتر ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسان کو مشورہ کی ضرورت پڑتی ہے علاوہ ازیں مشورہ سے باہمی ارتباط اور تعلقات بھی محکم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین" (آل عمران)

(ترجمہ) اُس رحمت کے سبب سے جو تیرا حصّہ ہے تو اُن کے ساتھ نرمی سے پیش آ۔ اور اگر تو بدخو اور سنگدل ہوتا تو یہ تیرے پاس سے متفرق ہو جاتے۔ پس ان سے درگذر کر ان کے لئے استغفار کر۔ اور اُن سے مشورہ کر اور جب تو عزم کر چکا تو اللہ پر توکل کر۔ بالتحقیق کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ تالیف قلوب کے لئے دوستوں کی غلطیوں سے درگذر کرنا اُن کے لئے استغفار کرنا اور ان سے مشورہ کرنا نہایت مفید چیزیں ہیں۔ علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے" الاستشارۃ

عین الھدایۃ وفی خاطرمن استبد برایہ۔" مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور اپنی رائے پر بھروسہ کرنے والا خطرہ میں ہے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم صرف اتنا ہی کہ جب کسی کو کوئی اہم کام درپیش ہو تو وہ ضرور مشورہ کرے کہ عین فلاح یہی ہے۔ میں اس مقام پر صاحبان عقل سلیم سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت سے کیونکر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ چند انسان اغراض خاص کے ماتحت ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور باہر آکر کہدیں کہ ہم نے فلاں شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا۔

اس تمام بحث کے علاوہ لفظ " امرہم " واقع ہوا ہے یعنی " اُن کا امر " اور پہلی بحث تو یہی ہے کہ خلافت آلہیہ " امر اللہ " ہے یا " امر الناس " اس بحث کو طے کرنے کے بعد اس مسئلہ کو آیت کے زیر سایہ لانے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ ورنہ بیکار ہے۔

خیالات کی نیرنگیاں ہر رنگ میں حیرت افزا ہیں۔ خلافت ثانیہ میں تو شورہ کو دخل نہیں دیا گیا۔ صرف جانے والے کا حکم تھا۔ دوسرے لفظوں میں ولیعہدی۔ پھر یہاں کیا ہوگا۔ الغرض آیۂ شوریٰ حضرات اہل سنت کے مان لئے ہوئے معنی کو محیط نہیں ہے اور نہ خلافت کی تنصیب کے لئے اسے استدلالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

خلفائے راشدین

یہ وہ بحث ہے جسے لکھ کر بخیال خود دنیائے تشیع پر وہ بار رکھ دیا گیا ہے کہ گویا قیامت تک سبکدوشی نہیں ہو سکتی۔ مگر پہلا سوال اس مسئلہ میں یہ ہے کہ "خلفاءؓ کے ساتھ" "راشدین" کی نسبت کہاں سے آئی۔ خدا سے؟ رسول سے؟ یا خود ساختہ؟

اس لفظ پر ایراد کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خلافت کے متعلق اسلام میں دو ہی نظریے پائے جاتے ہیں۔ یعنی (۱) خلافت من اللہ اور (۲) خلافت من الناس۔ ان میں پہلا عقیدہ تو گویا ہئی نہیں۔ لامحالہ دوسرا نظریہ پسندیدہ قرار پائیگا۔ اب اگر کوئی شخص پہلے عقیدہ کو چھوڑ دے جو بخیال حضرات موہوم ہے تو دوسرے موہوم میں تو مبتلا نہیں ہوگا۔ وہ صریحًا دیکھے گا کہ جتنے سلاطین مع خلفاءؓ اسلام میں گذرے ہیں وہ سب انہیں اصول کے تحت میں ہیں جو تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو خلیفہ کہنا اور کسی کو سلطان افتراق بے معنی ہے۔ بہ طرہ یہ کہ کچھ لوگوں کو راشدین سے ملقب کرنا اور کچھ لوگوں کو غیر راشدین قرار دینا بالکل بے ربط ہے۔ اگر خلفا کہنے میں کوئی خاص بات ہی

تو سب کو خلیفہ کہئے اور راشدین کہئے کو جی چاہتا ہے تو سب کو راشدین کہئے " ایک بار دو ہوا " ایک قسم کا تمسخر ہے۔

اب رہا یہ امر کہ کسی کی نیکیاں زیادہ ہیں کسی کی کم ہیں۔ ہوا کریں ہمیں کیا؟ اپنی اپنی گور اور اپنا اپنا عمل۔

میں اس کی مزید توسیع کئے دیتا ہوں کہ عنوان کے تحت میں جن حضرات کی سیرت نگاری کی جاتی ہے مطلب صرف یہی ہے نا؟ کہ اس تجلی سے اعتقاد آبائی کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی جائے اسے آزادی خیال نہیں کہتے۔ استدلال کا ایک جھونکا اس ساری تعمیر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ ان حضرات کے محاسن لاکھ گنوائے جائیں بہرحال وہ منصوص من اللہ تو نہیں ہیں انسان ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ اسلئے لوگوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقام میں ایک شیعہ کے نزدیک علی کی بھی کوئی خصوصیت نہیں اس لئے کہ شیعہ جو حضرت علی کو مان رہے ہیں وہ صرف اس لئے کہ منصوص من اللہ ہیں اور جب یہ عقیدہ ہی اُڑ گیا تو پھر علی بھی یکے از دیگراں ہیں۔ وہ کسی جماعت میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ اُن کا ایک ذاتی فعل ہوگا جو قطعاً کسی کے لئے حجت نہیں خلاصہ یہ کہ یہ "راشدین" کا ضمیمہ لفظ "خلفاء" کے ساتھ محض ایک جز اعتقادی ہے

اب میں اس طرف توجہ ہوتا ہوں کہ حضرات خلفاء کے ساتھ علی مرتضیٰ کا سلوک ایک شیعہ کی نگاہ میں کیا معنی رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ شیعہ خلافت آئمہ کے جس عقیدہ کو دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں اس عقیدہ کی رو سے صرف حضرت علی ہی امام نہیں ہیں بلکہ دوسرے حضرات ائمہ بھی ہیں اور اس عقیدہ کی بنا پر ہیں اور حضرت علی میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک دوسرے کے قول و فعل کے شارح ہیں۔ ان دوسرے بزرگواروں نے اپنے زمانہ کی حکومتوں کے ساتھ صلح و آشتی ہی کو اپنا طریقہ قرار دیا لیکن ان بزرگواروں کی اس صلح و آشتی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان حکومتوں کو شیعوں نے آج بھی حکومت حقہ تسلیم نہیں کیا اور نہ خود ان بزرگواروں کا کوئی ایسا ارشاد یا ہدایت ہے بلکہ اس کے خلاف ان کے اقوال موجود ہیں۔ ائمہ اہل بیت کا یہ عمل ہمارے نزدیک علی مرتضیٰ کے فعل اور عمل کا شارح ہے جس طرح وقتی مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ نے حکومت وقت کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ گذاری اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی۔ اور جس طرح ائمہ کا یہ فعل حکومت وقت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے اسی طرح علی مرتضیٰ کی مصالحت سے عند الشیعہ حقانیت حکومت وقت پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

شیعہ اگر خلافت الٰہیہ کے نظریہ کا حامی ہے تو اس کا یہی
اصولی جواب ہے جو عرض کیا گیا۔ پھر کیا حق ہے دنیا کو کسی کے
معتقدات کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر وہ بار رکھے جس کا وہ اصولاً منکر
ہے۔ اور اگر شیعہ اس عقیدہ سے دست بردار ہو کر اس دائرہ سے
نکل رہا ہے تو پھر اس کی آزادیٔ خیال کے سامنے امتیازات کی
کوئی دیوار حائل نہ ہونی چاہیئے۔ کس کے راشدین اور کس کے
غیر راشدین:۔

خوش نباشد جامہ نیمے اطلس و نیمے پلاس

اس بحث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اگر میں شیعہ حضرات کی مستند
احادیث سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو
غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤنگا۔"
خواب نہایت اچھا ہے۔ تعبیر ناظرین کے سامنے آجائے گی
میرے کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ کسی سطحی
مناظر کی تصنیف پر اعتماد کر کے حوالے اور عبارتیں لکھ دی گئی
ہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ کتابوں
کے نام تک صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے۔ شیعوں کی مشہور کتاب
حدیث "کلینی"! میں عرض کرونگا کہ شیعوں کے ہاں اس نام کی

کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ ایک کتاب حدیث "کافی" ہے۔ اس کے مصنّف کا نام ہے محمد بن یعقوب کلینی (کلین کے رہنے والے) ایسی دلچسپیاں بہت ہیں۔ ناظرین عنقریب ملاحظہ کریں گے۔

ہاں اس عنوان "خلفائے راشدین کے متعلق میں مجملاً کہہ آیا ہوں" لیکن ناانصافی ہوگی اگر مندرجہ ذیل خیال کے متعلق معروضہ نہ کیا جائے

"اگر خلفائے ثلٰثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت ہوتا تو حضرت علی جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر نہ کرتا اور پوری طاقت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرکے خدا ورسول کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلائے کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسندِ خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسینؑ کی طرح میدان کارزار میں تڑپتے نظر آتے

صلح و آشتی کی پالیسی کے متعلق تو میں کہہ چکا ہوں اور اس کے متعلق شیعی نمائندہ کا جواب جو درج کیا گیا ہے عقلیت پہ مبنی ہے ہاں یہ آخری سطور پر رائے زنی باقی ہے۔

یہ خیال جو آخر میں ظاہر کیا گیا ہے کوئی نیا خیال نہیں ہے جو بالفاظ مختلفہ اسے ہمیشہ دہرایا گیا ہے اور غالباً جب تک دنیا باقی ہے دہرایا ہی جائیگا۔

بہت خوب ! علیؑ قتل ہو جاتے ۔ قتل ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر نتیجہ ؟ شہادت حسینؑ سے جو نتیجہ مترتب ہوا وہ علیؑ کے قتل پر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا ۔ ہر فعل کی تاثیر میں زمانہ کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے ۔ علاوہ ازیں قتل علی کے معنی یہ تھے کہ حسنین بھی قتل ہو جاتے ۔ بلکہ تمام عمائد بنی ہاشم [illegible] کے گھاٹ اترتے ۔ نتیجہ کیا ہوتا ؟ صاف ظاہر ہے کہ حکومت بے کھٹکے اغیار کے ہاتھوں میں رہتی اور یہی جو اہل حکومت کی طرف سے بیرونی دنیا کے لئے جو تاریخی مواد پیش کیا جاتا ظاہر ہے وہ کیا ہوتا ۔

تاریخی واقعہ ہے کہ مالک بن نویرہ نے زکوٰۃ بھیجنے میں عذر کیا کہ رسول اللہ نے حکومت وقت کے لئے کوئی وصیت نہیں کی بلکہ وصیت کسی اور کے لئے ہے ۔ فوراً فوج بھیجی گئی ۔ اس قبیلہ پر کامل بربریت کے ساتھ حملہ کیا گیا ۔ بالآخر اس قبیلہ کا نام "مرتدین" کی فہرست میں لکھ دیا گیا ۔ کیا قتل ہو جانے کے بعد علی اور دیگر بنو ہاشم کا نام اس فہرست میں نہ آتا اور کیوں نہ آتا ؟ البتہ موقع علی نے نہیں دیا ۔

علاوہ ازیں علی کے قتل ہو جانے پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنو تیم اور بنو عدی اس حکومت پر رہ سکیں ۔ بنو امیہ موقع کی

تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان زندہ تھا۔ بنو ہاشم ہی تھے
جن کو وہ اپنی ٹکر کا سمجھتا تھا۔ ان کے بعد میدان صاف تھا باقی
بنو تیم اور بنو عدی اس کی ایک دھمکی سے خانہ نشین ہو جاتے
ابتدا سے ہی بنو امیہ سر پر سلطنت پہ آتے اور وہیں سے

ولعبت ھاشم بالملک لا   خبر جاء ولا وحی نزل

کے ترانے بلند ہو جاتے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو
ابوسفیان نے علی سے آکر کہا کہ اٹھو۔ مدینہ کو سوار اور پیادوں سے
بھر دوں گا۔ اگر علی اس کے دم میں آجاتے تو عین میدان کارزار
میں مخالفین سے مل کر بنو ہاشم کا خاتمہ کرا دیتے اور ان کے بعد پھر
دوسرے تھے ہی کیا۔ لیکن علی اس راز سے واقف تھے اس نے
جو نقشہ ڈالا تھا اسے سمجھتے تھے۔ لہذا جھڑک دیا اور صاف کہا
کہ تو منافق ہے۔

یہ ہیں وہ اندرونی ریشہ دوانیاں جن پر نظر کرتے ہوئے
اہل بنیہ یت نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اس وقت مدینہ میں جنگ
داخلی کا واقع ہو جانا نفس اسلام کے لیے مضر تھا اور ایسا مفسدہ کہ ابتدائے
بعثت میں جو نتیجہ حضرت پیغمبر کی شہادت سے نکلتا دیدہ ابتدائی خلافت

میں حضرت علی کے قتل ہو جانے سے برآمد ہوتا۔

اب اس کے علاوہ فتحیاب ہو کر تخت سلطنت پر متمکن ہو جانے میں علی کی حیثیت بادی النظر میں اسی بادشاہ کی سی ہوتی جو اپنے مخالفین کو تہ تیغ کر کے سریر سلطنت پر قدم رکھا کرتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا ہے "فصبرت علی طول المدۃ و شدۃ المحنۃ" اس طویل مدت اور رنج والم کی شدت پر میں نے صبر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اغراض ذاتی کا قدم اگر درمیان میں ہوتا تو شاید علی بھی کر گذرتے لیکن وہ اس سطح سے بلند ہیں۔

این زمین آسمانے دیگر است

اب میں ان منقولات پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فاضل مضمون نگار کو خدا جانے کتنی زحمت سے دستیاب ہوئے ہیں:۔

(۱) ایک خط کا مضمون رقم کیا گیا جو حضرت علی نے حاکم شام کو جنگ صفین کے دوران میں لکھا ہے۔ اس میں حضرات شیخین کی تمجید کی گئی ہے۔

"کتاب الفتوح" "ابن عاصم کوفی" "شرح نہج البلاغہ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ "ابن عاصم" میرے خیال میں صحیح نہیں بلکہ صحیح لفظ "ابن اعثم" ہے لیکن وہ

"ابن عاصم" ہو یا "ابن اعثم" اس کو شیعہ ظاہر کرنا ایک دلچسپ تحقیق کی ابتدا کرنا ہے۔

شرح نہج البلاغہ کا حوالہ بھی مشکوک ہے۔ نہج البلاغہ کی شرحیں کئی ہیں۔ فارسی بھی عربی بھی۔ علی ہذا شارح شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ اگر بالفرض شیعہ کی شرح ہو تو بھی اس پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔

حضرت امیر کا وہ خط جسے "محاسن کتب" سے تعبیر کرتے ہیں خود نہج البلاغہ میں موجود ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کا کیا مضمون ہوگا۔ اس کے چند فقرات درج کر دیتا ہوں:

"وزعمت ان افضل الناس فی الاسلام فلان و فلان فذکرت امرا ان تم اعتزلک کله وان نقص لم یلحقک ثلمه"

ارباب نظر جانتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے دعوے کی بنیاد خون عثمان پر رکھی تھی اور جہاں حرب اور ضرب سے [illegible] دعوی کی حقانیت کے لئے کافی پروپیگنڈا کیا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمان حضرات شیخین ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی تھے وہ چاہتا تھا کہ علی کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی ایسی تحریر مل جائے جو مخالفت شیخین پر محمول کیا جا سکے اور دنیا کو بتایا جا سکے کہ [illegible]

خلافت کے ابتدا ہی سے مخالف ہیں اور وہ شیخین کو اپنے مکتوبات
میں برا کہتے رہتے ہیں۔ اُن کے وقت میں وہ کچھ نہ کر سکے لیکن عثمان کے
وقت [illegible] میں جو قتل کیا گیا اور چونکہ عثمان شیخین کے قائم مقام تھے اور
[illegible] اُن کا شمار تھا لہذا اُنہیں قتل کیا اور وہ اس
خون [illegible] تب [illegible] علی کی طرف سے یہ جواب لکھا گیا
[illegible] کہ سوائے [illegible] کچھ اس [illegible] آتا تھا چنانچہ
اس [illegible] فرماتے ہیں:

[illegible] لکل الخلفاء حسدت و علی کلهم بغیت [illegible]
من ذلک کذ[illegible] فلیست الجنایة علیک فیکون العذر الیک"

" تیرا یہ گمان ہے کہ میں نے تمام خلفاء سے حسد کیا اور سب پر
بغاوت کی۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو تیری تو کوئی خطا نہیں کی
گئی کہ تیرے سامنے اس کا عذر کرنے کی ضرورت ہو۔ (تجھے کوئی
حق مداخلت حاصل نہیں)"

اس کے بعد ایک طعن اور بھی تیز ہے اور اُس کا جواب بھی
مرقوم ہے۔ اسی سے علی کی روحانی عظمت اُن کے مخالفین کی ذہنی
پستی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:-
" تو نے کہا ہے کہ میں بیعت کے لیے اس طرح لایا گیا جیسے

اونٹ کو نکیل سے کھینچتے ہوئے لاتے ہیں یہاں تک کہ میں بیعت کروں۔ خدا کی قسم تو نے میری مذمت کا ارادہ کیا مگر میری مدح کر گیا تو نے مجھے فضیحت کرنا چاہا مگر خود رسوا ہوگیا اس لئے کہ مظلوم ہونے میں مسلم کا کوئی نقصان نہیں جب تک وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلنے والا ہو"۔

اس خطبہ کے الفاظ سے حقیقت امر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علی کی بیعت کس طرح حاصل کی گئی معاویہ اس پر طعن کرتا ہے۔ علی اس واقعہ کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی وہ توجیہ کرتے ہیں جو علی ہی سے مخصوص ہے۔ اب غیر جانبدارانہ فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ ہے۔

(۳) الوافی الحمایہ۔ یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی کی تصانیف سے بتائی گئی ہے اور اس کی ایک روایت سے جس کے راوی سوید بن غفلہ ہیں اور جس سے شیخین کی کامل مدح ظاہر ہوتی ہے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ الوافی الحمایہ مجھے مجالس السالکین کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ اگر بالفرض یہ کتاب موجود اور خارجی بھی رکھتی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تک صحیح عبارت نہ دیکھ لی جائے اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے خود زید بن علی کا ایک واقعہ یاد آتا

ہے کہ جب اموی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو عین کارزار میں ایک شخص نے سوال کیا کہ شیخین کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ظاہر ہے کہ اس موقع پر اس کا ذکر کیا غیر ضروری تھا۔ چنانچہ جناب زید نے ٹال دیا اور کہا کہ اس کا جواب پھر دیا جائے گا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ عین جنگ میں ایک تیر زید کی پیشانی پر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ کچھ لوگ گرد جمع ہو گئے پوچھا وہ سائل کہاں ہے۔ وہ بھی آ گیا۔ اس سے کہا کہ دیکھو تعصب کے سبب سے مجھے یہ حالت دیکھنی پڑی۔

غرض علی یا بنو علی سے یہ توقع رکھنا کہ شیخین کی کوئی خاص عظمت ان کے دل میں ہو ایک غلط توقع ہے۔

(۳) تفسیر قمی کے حوالہ سے سورہ توبہ کی آیۃ "ثانی اثنین" کی تفسیر میں حضرت صادق سے ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت موجود ہے۔ لیکن اس سے فائدہ کیا ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے حضرت ابوبکر کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انھوں نے جعفر اور ان کے اصحاب کو سمندر میں دیکھ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ آپ صدیق ہیں اب کوئی بتائے کہ اس میں شیعوں کے خلاف کیا بات نکلی

یہ معجزہ اگر ہے تو رسول اللہ کا ہے شیعہ کب اس امر سے منکر ہیں کہ رسول اللہ کے ہمراہ حضرت ابوبکر غار میں نہ تھے۔ یقیناً تھے مگر محزون وملول تھے۔ ممکن ہے حضرتؐ نے اس طرح ان کو سکون دینا چاہا ہو۔

دوسری روایت اسی واقعہ کے متعلق جو تفاسیر شیعہ میں مروی ہے میں اُسے نقل نہیں کرتا۔ اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اس واقعہ سے کیا اثر لیا۔

اہل انصاف صرف اتنا دیکھ لیں کہ اگر ایسی ہی کوئی روایت علی کا استحقاق جتانے کے لئے شیعوں کی طرف سے پیش ہوتی تو اُن کو "سفیہ" بنانے کے لئے کوئی لغت باقی نہ رکھا جاتا۔

(۳) سورہ نور کی آیت "ان الارض یرثھا عبادی الصّٰلحین" کے متعلق ایک مضمون تفسیر خلاصۃ المنہج سے نقل ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ وعدہ خلفاء کے عہد میں پورا ہوا۔

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ آیت سورہ نور میں نہیں بلکہ سورہ انبیاء میں ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ "صالحین" نہیں ہے بلکہ "صالحون" ہے۔ یہ صفت ہے عباد کی اور عباد از روئے قانون عربیت مقام رفع میں ہے۔

ان غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور بغیر اصل کتاب

کی طرف رجوع کئے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ تفسیر عامہ میں یہ مضمون موجود ہے اور حسب عادت اہل علم مفسر نے اس قول کو بھی نقل کیا ہوگا۔ باقی تفسیر خاصہ میں اس آیت کے متعلق جو کچھ ائمہ سے نقل ہوا ہے اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔

(۵-۶) ان دو نمبروں میں کشف الغمہ کے حوالہ سے دو عجیب و غریب روایتیں نقل ہوئی ہیں:-

(۱) علی کا قول ہے کہ جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے۔

(۲) حضرت ابوبکر کی وفات پر حضرت علی بہت روئے اور کہا "آج نبوت کی خلافت منقطع ہوگئی"۔

اہل علم سے گذارش ہے کہ کتاب "کشف الغمہ" موجود ہے شیعی عالم کی تالیف ہے کتاب کا پورا نام ہے "کشف الغمہ فی مناقب الائمہ"۔ نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ موضوع کتاب کیا ہے؟ حضرت رسول اللہ سے لیکر امام دوازدہم تک کے مناقب و فضائل بیان ہوئے ہیں۔ التزام یہ کیا ہے کہ ہر دو فریق کی روایات بہ سلسلۂ مناقب و فضائل درج کر دی جائیں۔

اہل عقل خود انصاف فرمائیں کہ مولف کتاب ہر دو روایات مندرجہ بالا کو

درج کتاب کرکے اپنے موضوع کو کون سی قوت پہونچا سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے حالات حضرت امیر غور سے پڑھے اور افسوس ہے کہ مجھے ان دونوں روایتوں کا کہیں اشارہ بھی نہ ملا۔ اس کے برعکس مولف کتاب کی اور شئے کو درج کر رہا ہے جو قابل ملاحظہ ہے:

"فی ذکر الصدیقین۔ من مناقب ابن المغازلی عن ابن عباس"۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ تحت آیت "السابقون السابقون" ابن عباس سے مروی ہے کہ یوشع بن نون نے موسیٰ کی طرف سبقت کی اور صاحب آل یٰسین نے عیسیٰ کی طرف اور علی بن ابیطالب نے محمد بن عبداللہ کی طرف اور وہ اُن سے افضل ہے۔

دوسری روایت مسند امام احمد بن حنبل سے نقل کی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے خود علی کی زبان سے سنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس کے رسول کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں اور میرے سوا جو کوئی بھی اس کا قائل ہو وہ مفتری و کاذب ہے۔ میں نے تمام لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

یہی مضمون مسند لقیط ابویعلیٰ سے نقل ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب شیعہ بصائرالدرجات سے ایک حدیث اس بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مضمون دیگر کتب شیعہ میں بکثرت پایا جاتا ہے

خود مولف کتاب نے بحث القاب میں حضرت علی کا لقب صدیق اکبر تحریر کیا ہے۔ اب بتایا جائے وہ حدیث کس گوشہ میں چھپی ہوئی ہے جس سے استدلال فرمایا گیا ہے اور یہ حدیث ختم خلافت نبوت تو اور بھی مزیدار ہے۔

(۷) "فصول امامیہ" سے ایک حدیث حضرت باقر سے درج کی گئی ہے روایت کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا ہی جانے۔

لیکن اس نام کی کوئی کتاب شیعی تصنیفات میں نہیں ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ فصول امامیہ کون سی کتاب ہے اور کس فن میں ہے۔ کم از کم میرے علم میں تو نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میرا محدود علم حجت نہیں ہے۔ لہذا ایک عراقی بزرگوار سے رجوع کی گئی جو ایک وسیع نظر کے مالک ہیں۔ انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ عجب نہیں "فصول المہمہ" مراد ہو جو ابن صباغ المالکی تالیف ہے اور چونکہ یہ کتاب مناقب ائمہ اہلبیت میں ہے اس کے مولف کو شیعہ ظاہر کر دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ اسی شبہ پر "فصول ائمہ فی معرفۃ الائمہ" کو دیکھا گیا۔ حضرت باقر کے حالات میں تلاش کی گئی کہ یہ حدیث یا روایت جو کچھ بھی ہے وہیں ملنی چاہئے۔ کئی گھنٹے خراب کئے اور نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس قسم کے غلط

حوالوں کا مطلب کیا ہے؟ تحقیق حق؟ یا مخاطب کو پریشان کرنا۔ مذہب
کی حمایت جب ایسے حیلہ حوالوں پر منحصر رہ جائے تو یہ وقت اس مذہب
کے لئے نہایت بیکسی کا وقت ہوتا ہے۔

یہ تو حوالہ کی حالت ہے۔ اب رہی حدیث۔ اس کے متعلق چند
الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

فاضل مضمون نگار نے احادیث کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے
"احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل
طے کرنے کے باوجود کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال
نہیں تو ناممکن ضرور ہے"۔

یہ گویا عذر فرمایا گیا ہے اس امر کا کہ شیعہ متکلمین جو احادیث
کتب اہل سنت سے پیش کرتے ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں۔ سوال
یہ ہے کہ آیا یہی حق شیعوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں۔ اور نہیں تو کیوں؟
اگر شیعہ استدلال کریں تو ہر مشہور کتاب بے ہر مقبول راوی ناقابل اعتبار
اور اگر حضرات اہل سنت استدلال کریں تو شیعوں کا فرض ہے کہ مجہول
روایت اور ہر نامعلوم کتاب کو مستند تسلیم کرلیں۔ ایں چہ بوالعجبی است۔
اب میں دیکھتا ہوں نفس مضمون حدیث کو جس سے معلوم ہوتا
ہے کہ خلفاء ثلٰثہ کے بارے میں ان لوگوں کو خوض کرنے سے منع کیا گیا

معلوم ہے کہ حضرت باقرؑ کا زمانہ بنو امیہ کے شباب کا زمانہ ہے اور بنو امیہ کی نگاہیں اہل بیت کی طرف کیسی تھیں اس کا جواب تاریخ دے سکتی ہے۔ اور آپ خود بھی واقف ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کی بنیادیں خلافت شیخین پر قائم ہوئی تھیں اور حضرات ثلثہ یا انکی حکومتوں پر تنقید کرنا حکومت وقت کو بُرا کہنا تھا۔ ایسے وقت میں ان عوام کو جو گذرگاہ پر بیٹھ کر یہ تذکرے کرتے تھے اگر حضرت نے سختی کے ساتھ رد کا تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت باقر علیہ السلام کی محتاط زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جابر ابن یزید کو ایک کتاب دیجاتی ہے کہ اسے حفظ کرو لیکن جب تک بنو امیہ کی حکومت ہے اس کتاب کا ایک لفظ ظاہر نہ کرو۔[1]

اگر جناب باقرؑ کے ان اشاروں پر جو بہ نظر مصلحت تھے آپ استدلال کر رہے ہیں تو حضرت کے دوسرے ارشادات پر بھی آپ کو نظر فرمانی چاہیئے

---

[1] شیعہ مسئلہ تقیہ کو مانتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے نفسِ حدیث پہ پر اشارہ بھی کیا ہے میں عرض کرتا ہوں کہ "دل میں بت۔ زبان پر خدا" اسے نفاق کہتے ہیں اور دل میں خدا۔ زبان پر بت "تقیہ ہے وہ بھی عند الضرورت۔ پڑھئے سورۂ نحل کی یہ آیت "من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان"۔

(٨) ہاں نہج البلاغہ میں یہ خطبہ مذکور ہے حضرت آپ نے جناب خلیفہ دوئم کو میدان میں جانے سے روکا ہے۔ بہتر ہو کہ مناظرین اہل سنت اس خطبہ کو درمیان میں لانے سے جناب فرمائیں، کیونکہ اس صورت میں سب سے پہلے حضرت خلیفہ دوئم کی مہارت جنگ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر وضاحت کافی ہے کہ علی کے زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوئیں۔ علی بہ نفس نفیس ان میں شریک تھے اس سے بڑھ کر یہ کہ غزوات میں خود رسول اللہ شریک ہوتے تھے۔ گویا غزوات میں خود شریک ہونا سنت پیغمبر ہے پھر حضرت خلیفہ دوئم کو اس سنت رسول سے کیوں روکا گیا؟ بات یہ ہے کہ رسول اللہ کا یا علی مرتضیٰ کا لشکر کے ساتھ ہونا ہر جہت سے مفید تھا اور حضرت ممدوح کی ہمراہی جنگی نقطۂ نگاہ سے لشکر کے لئے مضر تھی اور علی جانتے تھے کہ اس حضرت کا اثر اسلام کی عمومی حالت پر اچھا نہ پڑیگا۔ لہذا تالیف قلب کے ساتھ روک دیا۔

(٩) "جلاء العیون" کے باب وصایا سے حضرت علی کی وصیت نقل کی گئی ہے:۔

"اصحاب رسول کی رعایت کرو کہ انہوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے دیا۔"

یہ حوالہ صحیح ہے مگر بغیر کتاب دیکھے ہوئے نقل ہوا ہے۔ بس

عین عبارت نقل کرتا ہوں۔

"از خدا بترسید در باب اصحاب پیغمبر خود در رعایت نمائید آنہا را کہ در دین خدا بدعتے نکردہ اند وصاحب بدعتے را پناہ نہ دادہ اند بدرستیکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وصیت فرمودہ در حق ایں گروہ از صحابہ خود ولعنت کردہ برکسے کہ بدعتے کند از صحابہ وغیر صحابہ کسے را کہ صاحب بدعتی را پناہ دہد ویاری کند"

ترجمہ:۔ اپنے پیغمبر کے ان اصحاب کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ جنھوں نے دین خدا میں کوئی بدعت نہیں کی اور صاحب بدعت کو پناہ نہیں دی۔ بدرستیکہ حضرت رسول نے اپنے اصحاب کے اس گروہ کے بارے میں وصیت کی ہے اور لعنت کی ہے اُس شخص پر جو بدعت کرے۔ وہ صحابہ سے ہو یا غیر صحابہ سے۔ اور اُس پر جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اُس کی مدد کرے۔"

شکر ہے کہ ابھی ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ دیکھیں کہ عبارت کتاب کیا کہتی ہے اور مفہوم کیا لیا گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تحریف معنوی کی اتنی دلچسپ مثالیں دقت ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

[illegible] کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے کہ وصیت اُن اصحاب کے

بارے میں کی گئی ہے کہ جو بدعتی نہ ہوں اور بدعتی کو پناہ دینے والے
نہ ہوں اور جو بدعتی ہوں خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی اُن پر
لعنت کی گئی ہے۔ مترجم نے پہلی سطر کو دیکھ کر دھوکا کھایا ہے
"آنہارا" کو پہلے جملے سے متعلق کر کے جملہ ختم کر دیا ہے اور اس طرح عبارت
اپنے آخر جزو سے نامربوط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو مفید سمجھا ہے اور اس
پر اکتفا کی گئی ہے

"الوہی خلافت"

اب تک جس قدر توضیح کی گئی ہے اُس کے لحاظ سے اہل نظر غالباً
شیعی عقیدۂ خلافت کو سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ
کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کی صحیح ترجمانی نہیں کی جاتی۔

اب اس عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کے اعتراضوں کا
جواب بھی پیش کیا جاتا ہے اگرچہ اس میں بیشتر وہی امور ہیں جن کی تفصیل
کی جا چکی ہے۔

تحریف قرآن کے متعلق حیات القلوب کی عبارت "ثلث قرآن
در فضائل اہلبیت و ثلثے در مثالب دشمنان اہلبیت است کہ بعضے
[illegible]

اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی مسلم الثبوت کتاب ہے اسکا ثلث حصہ مناقب اہل بیت پر اور ثلث مثالب دشمنان اہلبیت پر مشتمل ہے، اسکا وہ مفہوم ہرگز نہیں جسے فاضل مقالہ نگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ روایتیں جو کتب شیعہ سے پیش کی گئی ہیں۔ اور جو عدم نص امامت علوی پر (بخیال مضمون نگار) دلالت کرتی ہیں۔ لائق غور ہیں۔

(۱) اہل تشیع کے مشہور مجتہد بحرانی نے شرح نہج البلاغہ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ خلاصہ روایت یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ نے حضرت حفصہ کو خبر دی کہ میرے بعد ابو بکر خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیرا باپ حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ سے کہہ دیا۔

یہ مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے۔ اور یہ چیزیں ہمیشہ سے شیعوں کے پیش نظر رہی ہیں شیعہ نظریہ ان روایات کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر کوئی پیشین گوئی کی جائے تو یہ پیشین گوئی کسی واقعہ کی حقانیت یا عدم حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجئے آج یہودی فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر قابض ہیں اور اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی کسی کتاب سماوی میں پائی جائے تو کیا اس سے یہود کی حقانیت پر دلیل لائی جا سکتی ہے۔

حضرت رسول اللہ نے حضرت علی کو وصیتیں کرتے ہوئے خبر دی کہ

کہ میرے بعد یہ امور ظہور میں آئیں گے جس پر علی نے پوچھا کہ ہمارا ویہ
کیا ہونا چاہیئے فرمایا "صبر" یہی وہ راز باطنی ہے جس پر اہل دل عمل
کرتے ہیں اور اہل دنیا کوئی طعنہ اٹھا نہیں رکھتے۔ الغرض یہ پیشین گوئی
حضرات خلفاء کی حقیت کو ثابت نہیں کرتی۔

(۲) جلاء العیون میں لکھا ہے کہ حضرت رسول پر جب مرض کا
غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت
عباس کے سپرد کر دیں۔ حضرت عباس نے کہا یہ کام مجھ سے نہ ہوگا بہتر
بجائے حضرت علیؑ کے سپرد کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ رسول
کریم اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علی ہی کو خلافت کا حقدار
تصور نہ کرتے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبارت نقل کر دوں تاکہ مجھ کو
مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

"اے عم پیغمبر قبول کن وصیت مرا در اہل من و در زنان من و بگیر
میراث مرا و ادا کن دین مرا و وعدہائے مرا بعمل بیاور و ذمۂ من بری
بگرداں۔ عباس گفت یا رسول اللہ من مرد پیر عیال دارم و تو از ابر
بہاری بخشندہ تری و مال من وفا نمی کند بوعدہ ہائے تو و بخششہائے
تو ایں را از من بگرداں بسوئے کسے کہ طاقتش از من بیشتر باشد

وحضرت سہ مرتبہ این سخن را برا و اعادہ کرد و در ہر مرتبہ او چنیں جواب گفت پس حضرت فرمود کہ میراث خود را بکسے دہم کہ قبول کند آں را کہ حق قبول کردنی است وسزاوار آں باشد چنانچہ تو گفتی جواب گوید پس با حضرت امیر المومنین خطاب کرد و فرمود یا علی تو بگیر میراث مرا کہ مخصوص تست وکسے را با تو نزاعے نیست وقبول کن وصیت مرا وعمل بیاور وعدہ ہائے مرا واداکن قرضہائے مرا یا علی خلیفہ من باش بعد اہل من وتبلیغ رسالت من بعد از من بجا آوردم بکن۔

(ترجمہ) "اے چچا میرے اہل کے بارے میں اور میری عورتوں کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو اور میری میراث لے لو میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں کو عمل میں لاؤ اور مجھے بری الذمہ کردو عباس نے کہا یا رسول اللہ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ عیال دار ہوں آپ ابر بہاری سے بڑھ کر بخشش کرنے والے۔ میرا مال آپ کے وعدوں اور آپ کی بخششوں کے لئے وفا نہیں کر سکتا۔ اس وصیت ومیراث کو اس کی طرف پلٹائیے جس کی طاقت مجھ سے بیشتر ہو۔ حضرت نے تین مرتبہ اسی ارشاد کو دہرایا اور ہر مرتبہ عباس نے یہی جواب دیا۔ پس حضرت نے فرمایا کہ اپنی میراث [illegible] دونگا کہ جو [illegible] اسی طرح قبول [illegible] قبول کرنے کا حق

ہوتا ہے اور وہ اُس کے لئے سزاوار ہو اور جس طرح تو نے کہا اُس طرح جواب نہ دے۔ پس حضرت امیرالمومنین سے خطاب کیا اور فرمایا یا علی تو میری میراث لے کہ تجھ ہی سے مخصوص ہے اور کسی کو تجھ سے نزاع کا حق نہیں۔ میری وصیت قبول کر۔ میرے وعدوں کو عمل میں لا۔ میرے قرضوں کو ادا کر۔ اے علی میرے اہل میں میرا خلیفہ ہو اور لوگوں پر میرے پیغاموں کی تبلیغ کر۔"

یہ ہے عین عبارت اور اُس کا ترجمہ۔ میں اس روایت پر ازروئے درایت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نفس مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس روایت میں میراث کا تذکرہ ہے۔ حضرت رسولؐ اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اگر میری میراث لینی چاہتے ہو تو ان شرائط کے تحت لے سکتے ہو۔ عباس اپنے افلاس کا عذر کرتے ہیں۔ تین مرتبہ یہی بات دہرائی جاتی ہے تاکہ عباس کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اور آخر یہ شے علی مرتضیٰ کو تفویض ہوتی ہے۔ نزاکت کلام یہ بھی ہے کہ عباس سے فرماتے ہیں "قبول کر وصیتی [illegible] [illegible] [illegible] اور علی سے فرماتے ہیں "علی خلیفتی [illegible] [illegible] [illegible] رسالتی من بعد [illegible]

[illegible]

کیا فائدہ اس جواب سے ظاہر ہے "یا رسول اللہ من مرد پیر وعیال دارم" ظاہر ہے کچھ حق کا معاملہ تھا اور اہل رسول و زنان رسول کی خبر گیری کا بار پڑتا تھا۔ اس لئے انکار کر دیا۔

میں نہ سمجھ سکا کہ خلافت و امامت سے اسے ربط کون سا ہے واقعات کے سلسلہ میں بھی یہ بات نہ گزری تھی جو معترض نے پیدا کی اور علی کو بھی جو یہاں مقام میں خلافت دی گئی ہے وہ خلافت خاصہ ہے یعنی اہل رسول و زنان رسول کے مثل رسول محافظ و نگران رہیں اور ان کا حکم مثل رسول ان پر جاری ہو غرض معترض کے پیش کردہ نتیجہ سے اس روایت کو کوئی تعلق نہیں۔

• (۳) ملا باقر مجلسی نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ ایک بار نبی کریمؐ نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں خدائے تعالیٰ نے سب روا کر دیں آخر شب میں حضرت علی بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسول خدا نے فرمایا اے علی تمہاری خلافت و امامت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی (حیات القلوب جلد ۳)

فاضل مقالہ نگار نے اس مقام پر یہ فخریہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر میں حدیث گڑھنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ صاف

واضح اور غیر مبہم حدیث گڑھنے میں شاید مشکل کامیاب ہو سکتا۔

اب ذرا اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

"حضرت رسول شبے در مسجد ماند چوں نزدیک صبح شد حضرت امیر المومنین داخل مسجد شد پس حضرت رسول او را ندا کرد کہ یا علی گفت لبیک۔ فرمود کہ بیا بسوئے من چوں نزدیک شد حضرت فرمود تمام ایں شب را دیدی من بیدار بودم و ہزار حاجت تو را از خدا سوال کردم و ہمہ را بر آورد و مثل آنہا را نیز برائے تو سوال کردم و باز ہمہ عطا کرد و سوال کردم از برائے تو کہ ہمہ امت را مجتمع گرداند۔ برائے تو کہ ہمہ اقرار کنند بخلافت تو، قبول نہ کرد و ایں آیات را فرستاد" الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ولقد فتنا من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین

(ترجمہ) "ایک شب رسول نے مسجد میں قیام فرمایا جب صبح نزدیک ہوئی تو حضرت امیر المومنین داخل مسجد ہوئے۔ تب حضرت رسول نے آواز دی یا علی۔ عرض کی لبیک۔ فرمایا میرے پاس آؤ۔ جب نزدیک آئے فرمایا تم نے دیکھا کہ یہ رات میں نے بیدار بسر کی ہے اپنی ہزار حاجتیں خدا سے طلب کیں۔ خدا نے انھیں پورا کیا، ویسی ہی کی مانند (ہزار حاجتیں) تیرے لئے بھی سوال کیا۔ وہ تمام سوال بھی

ہو رہے کہنے۔ اور میں نے سوال کیا امانت کو تیرے واسطے جمع کر دے کہ سب تیری خلافت کا اقرار کریں اور سب تیرے تابع ہوں یہ سوال قبول نہ ہوا اور یہ آیات بھیجی گئیں۔ الم۔ کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کیا مانا کہ دینا پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائیگی اور البتہ ہم نے ان کو بھی آزما لیا جو ان سے پہلے گذر چکے اور البتہ خدا جانتا ہے جو سچے ہیں اور البتہ خدا خوب جانتا ہے انھیں جو جھوٹے ہیں۔"

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ منزل وحی نے حقائق کو نہایت سادہ زبان میں بیان فرمایا ہے۔ علی کو بتایا جا رہا ہے کہ مشیت الٰہی کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی۔ لہذا ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگوں کو خداوند عالم مجبور کرکے تیری خلافت پر مجتمع کرے اور جبر سے کام لے کر انھیں تیرا تابع بنائے بلکہ ایک شان اختیاری کے ساتھ انھیں معرض امتحان میں رکھا گیا ہے اور لوان کے لئے وجہ امتحان ہے اور یہ آیات سورۂ عنکبوت اس مسئلہ پہ روشنی ڈال رہی ہیں۔"

یہ ہے وہ مطلب جو اہل عقل اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں اب کیا اہل انصاف میری طرف سے دریافت کر سکتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ مفہوم کہاں سے پیدا کیا ہے اور "اے علی ہم نے تمھاری

ولایت وخلافت کے واسطے دعا مانگی وہ نامنظور ہوئی۔ یہ کون سی عبارت کا ترجمہ ہے

(۴) ایک روایت عیون الاخبار سے نقل فرمائی گئی ہے کہ حضرت خضر نے علی مرتضیٰ کو رابع الخلفا کہکر سلام کیا۔

فاضل مناظر نے عیون الاخبار تو نہیں دیکھی۔ اس کا تو یقین ہے۔ لیکن خیر اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ مضمون شیعوں میں مشہور ہے اور معمولی معمولی اہل ممبر بھی اسے بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی جملہ ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ خلفائے اربعہ شیعوں کے نزدیک حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت آدم (۲) حضرت داؤد (۳) حضرت ہارون (۴) حضرت علی۔ کہا جائے گا کہ یہ تاویل ہے اور خدا جانے کیا ہے میں عرض کرونگا کہ جس قسم کی اصطلاح ہو وہی اس کی تشریح کی حقدار ہوتی ہے۔ عقلا کبھی اس پر ایراد نہیں کرتے۔ تمام علوم وفنون میں یہی قاعدہ جاری ہے۔

(۵) نہج البلاغہ کے حوالے سے یہ عبارت نقل ہوئی ہے۔

" ان امیر المؤمنین قال الناس جماعۃ وید اللہ علیھم غضب اللہ علی من خالف الجماعۃ انا واللہ اہل السنۃ والجماعۃ "

امیر المومنین نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا اس پر غضبناک ہوتا ہے۔ خدا کی قسم میں اہل سنت والجماعت ہوں (یعنی سنت رسول کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

آخر کلام میں افتخار ارشاد ہوا ہے کہ ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے کوئی توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

اہل علم جانتے ہیں کہ عبارتوں سے جو مطالب وضع کئے جاتے ہیں اُن کی صحت پر یقین کرنے کی ایک میزان ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مفہوم صحیح ہے یا غلط۔ اسی معیار پر پیش کردہ عبارت کے مفہوم کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (نتیجہ) پس لوگوں پر اللہ کا ہاتھ (مفہوم اوّل)

(۳) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت کی شان یہ ہے کہ اُس کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (نتیجہ) پس لوگوں کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (مفہوم ثانی) ماشاء اللہ کیا خوب عبارت اور کیا خوب مفہوم۔

" انا واللہ اھل السنۃ والجماعۃ " یہ تو معلوم ہے کہ

اصطلاحی معنوں میں تو یہ کلمہ" اہل السنۃ والجماعۃ " استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ اصطلاح مولد ہے اور بعد کو وضع کی گئی ہے اسی لیے ترجمہ میں بھی اس کی توجیہ فرمائی گئی اب معلوم نہیں ہوتا کہ اس جملہ سے کیا فائدہ اٹھانے کی توقع کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ نہج البلاغہ کے کس خطبہ میں یہ عبارت مرقوم ہے۔ آیا خطبات میں ہے؟ فرامین میں ہے۔ کلمات مختصرہ میں ہے؟ کہاں ہے؟

ارباب علم ہرگز تعجب نہ فرمائیں۔ مذہب عمومی کی بنیاد انھیں دلچسپ عداقتوں پر اٹھائی جاتی ہے۔ اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ہمیشہ سے یہی نسخہ استعمال ہوا ہے،

سیاسی اختلاف

اس عنوان کے ماتحت اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب شیعہ کی ابتدا عبداللہ بن سبا ایک نومسلم یہودی سے ہوئی۔

میں پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کو طنزاً نومسلم کہنا درست نہیں اس لئے کہ اسوقت جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین قریش ہوں یا غیر قریش۔ یہودی ہوں یا نصرانی۔ سب کے سب

نو مسلم تھے سوائے ایک مخصوص خانوادہ کے مخصوص افراد کے کہ ملت ابراہیمی جن کے سینوں میں بطور امانت چلی آرہی تھی۔ اس کے بعد فاضل استرآبادی کی تحریر سے استدلال کیا گیا ہے اور یہ تحریر پیش کی گئی ہے۔

"وکان (عبد اللہ بن سبا) اول من شرع القول بفرض امامۃ علی"

"عبد اللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علی کی امامت مذہبی فریضہ ہے۔"

اب ارباب نظر انصاف کی آنکھوں سے اس دعوی کو ملاحظہ فرمائیں، میں فاضل مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی بدولت کتب رجال کی ورق گردانی کا موقع ملا۔ فاضل استرآبادی کا پورا نام ہے "مرزا محمد بن علی بن ابراہیم استرآبادی" کتاب کا نام ہے "تلخیص المقال فی اسماء الرجال" اس کی عبارت یہ ہے:۔

"عبد اللہ بن سبا غال ملعون، کان یزعم ان علیا الٰہ وانہ نبی لعنہ اللہ"

بس عبد اللہ بن سبا کے ترجمہ میں یہی دو تین سطریں اس کتاب میں مرقوم ہیں۔ اس سے زیادہ ایک حرف نہیں یعنی عبد اللہ بن سبا غالی ہے ملعون ہے۔ وہ گمان کرتا تھا کہ علی خدا ہے اور وہ خود نبی ہے

خدا اس پر لعنت کرے،

اگر اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے کہیں انصاف ہے تو اس علمی خیانت کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ مزید توضیح کے لئے علامہ بہبہانی کا قول بھی نقل کئے دیتا ہوں۔

"عبداللہ بن سبا اصحاب امیرالمومنین سے تھا جو کفر کی طرف پلٹ گیا اور جس غلو کا اظہار کیا حضرت صادق سے منقول ہے کہ عبداللہ بن سبا نبوت کا مدعی تھا اور گمان کرتا تھا کہ امیرالمومنین خدا ہے یہ خبر امیرالمومنین کو پہونچی۔ آپ نے اُسے بلایا اور پوچھا اس نے اقرار کیا اور کہا تو ہی خدا ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ تو خدا ہے اور میں نبی ہوں۔ امیرالمومنین نے اُس سے فرمایا کہ تجھے شیطان نے مسخرہ بنایا ہے۔ اس قول سے رجوع کر تیری ماں تیری ماتم میں بیٹھے۔ آپ نے اصرار کیا اور اُس نے انکار حضرت نے اسے تین دن قید رکھا اور چاہا کہ توبہ کرے مگر اُس نے توبہ نہ کی اُسے قید خانہ سے نکالا اور آگ میں جلا دیا۔"

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ عند الشیعہ "عبداللہ بن سبا" کی کیا ہستی ہے۔

اب یہیں سے عین اللہ و یداللہ وغیرہ کی بابت سُن لیجئے۔ اگر یہ روایت شیعہ

یہ کلمات علی کی زبان لکھے یا کسی دوسرے معصوم کی زبان سے نکلے ہوئے ثابت ہو جائیں تو بیشک ان پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ گو یہ بھی شیعی معتقدات کے آسمانی تخیل کو متاثر نہیں کر سکتے۔ البتہ علمائے سنت والجماعت میں بکثرت ایسے حضرات مل سکتے ہیں جنھوں نے اس سے بھی بڑھ کر کچھ کہا ہے۔ پھر اُن کے متعلق کیا رائے ہے؟

علامہ مجلسی کا قول حضرت امام حسین کی بابت جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ زندہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ یہ ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے اس سے شیعی اصول مذہب کا کیا تعلق اور کسی طائفہ گمنام کا قول نقل کر دینا کس جرم میں داخل ہے؟

شیخ ابو جعفر طوسی سے جو روایت نقل کی گئی ہے اُس کی صحت بھی اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں "کہ محبت اہل بیت تمام اعمال کی روح ہے" یہ عقیدہ شیعہ ہے۔ حضرات اہل سنت نہیں مانتے نہ مانیں۔

اب رہا دوست دشمن کے متعلق ارشاد علوی اُس کے متعلق "کلینی" اور "مسدی" کا بے تکا جوڑ ملانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قول نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ "هلك فی رجلان محب غال و مبغض قال" میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوئے دوست

جو غلو کرے اور وہ بغض رکھنے والا جو میرے مرتبہ میں کلام کرے"۔
غلو کی حالت تو معلوم ہو گئی اب یہ مراتب علویہ میں کلام کرنے والا کون ہے؟ ارباب نظر اس کی تنقید فرمائیں۔
منقولات کے متعلق انتہائی اختصار کے ساتھ مجھے جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکا۔ اس تحریر میں میرا نقطۂ نگاہ اس مجیب کا سا ہے جس نے صرف دفع ایراد کے لئے قلم اٹھایا ہو ورنہ اثبات مطلب کے لئے میدان دوسرا ہے۔
آخر میں یہ سوال ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ "عبداللہ بن سبا" کے واقعہ کو سیاسیات سے کیا تعلق ہے۔ ایک شخص اسلام لایا پھر کفر اختیار کیا علی کو خدا کہنے لگا۔ اسے جلا دیا گیا، اس میں کون سا سیاسی پہلو ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اصحاب علی میں سے تھا تو اس سے ذات علی یا دیگر اصحاب علی یا تشیع پر کیا الزام؟ بات دور جاتی ہے اور میں اس عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔
اب میں اس ایراد کی طرف توجہ کرتا ہوں جس طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیعہ مسلک کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر قائم کی گئی ہے۔
ناظرین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ مذہب شیعہ کے اصول

یہ ہیں:۔

(۱) خدا کو واحد و یکتا ماننا (۲) خدا کو عادل ماننا (۳) نبوت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور انبیاء کو معصوم سمجھنا (۴) خلافت و امامت کو من اللہ قبول کرنا (۵) روز جزا پر اسی حیثیت سے ایمان لانا جس حیثیت سے پیغمبر نے تعلیم دی ہے۔

ان اجزا پر نظر کرتے ہوئے مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ کس دلیل کی بنا پر مذکورہ بالا الزام درست ہو سکتا ہے۔

ہاں خلافت کے معاملہ میں وہ لوگ جو دنیوی حیثیت سے مسلمانوں کے حاکم بنے، شیعوں کے نزدیک انھیں مذہباً کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ایسے چند اشخاص کے خلاف جو مبعوث یا منصوص من اللہ نہیں وہ اپنے نقطہ نظر سے مخالفانہ اظہار خیال پر مجبور ہیں۔

یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ انسان جس شے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس سے اظہار بریت کر ہی دیتا ہے۔ اگر انبیاء کا فعل قابل اقتدا ہے تو سورۂ توبہ کی اس آیت کو پڑھئے:۔

"وما کان استغفار ابراهیم لابیه الا عن موعدة وعدها ایاه فلما تبین له انه عدو لله تبرأ منه ان ابراهیم

لاواہ حلہ "
اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے دوست کا دشمن ہو اس سے اظہار براءت کرنا علم کے خلاف نہیں ہے۔
اس مسئلہ کی نظری حیثیت اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسروں کے جذبات کا احترام البتہ یہ ضروری شے ہے لیکن مثل مشہور ہے کہ " اکرم تکرم " ۔ اکرام کرو تمھارا بھی اکرام کیا جائیگا ۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ۔ اگر کوئی طبقہ اپنی کثرت کے اعتبار پر خود جس طرح چاہے عمل کرے اور قلت سے اپنے جذبات کے احترام کا متمنی رہے تو یہ نباہ کی باتیں نہیں ہیں ۔

ذاکر حسین

مسئلۂ خلافت و امامت

مدیر نگار کے نام ایک خط

(از جناب سید احتشام حسین صاحب ایم اے)

محترمی نیاز صاحب تسلیم۔ ایک مدت کے بعد پھر آپ کا کچھ وقت لینا چاہتا ہوں۔

مسئلۂ خلافت و امامت کے متعلق مجھے بھی چند سطریں لکھ کر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت دیجئے۔ اس کا محرک بزمی صاحب کا وہ مضمون ہے جو آپ کے یہاں جولائی میں شائع ہوا ہے۔ اس خط میں بزمی صاحب کے مضمون کا جواب نہیں پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ آپ سے تبادلۂ خیال چاہتا ہوں کیا عقل عمومی اسی کا نام ہے جسے بزمی صاحب نے پیش کیا ہے؟ کیا قرآن اور تاریخ اسی طرح پڑھنا چاہئے جیسے بزمی صاحب نے پڑھا ہے؟

ایک صاحب سے آپ کے اعلان کی خبر مل چکی تھی کہ کوئی علوم مشرقی و مغربی کا عالم اس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہے۔ اس لئے کچھ انتظار بھی

تھا۔ اس مسئلہ پر ایک سنجیدہ نقطۂ نظر کی بڑی ضرورت ہے اس
لئے بڑی امیدوں سے اُسے پڑھا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں کہ بڑی مایوسی ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنی قسم کے بہت
سے مضامین کی طرح ایک مضمون ہے بلکہ اس لئے کہ "شور" کے
لحاظ سے "دل" کو ایک "قطرۂ خون" پا کر جو مایوسی ہو سکتی ہے
وہی ہوئی۔

میں علوم مشرقی و مغربی کا عالم تو نہیں۔ ہاں ایک طالبعلم
ضرور ہوں۔ میں اپنی قابلیت اور معلومات کے حدود سے بھی اچھی
طرح واقف ہوں۔ اس لئے چاہتا تھا کہ اس مباحثہ میں شریک
نہ ہوتا لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ عقل عمومی کے بھیس میں کچھ اور
پیش کیا جا رہا ہے تو مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ جب درایت اور عقل
کا غلط استعمال دیکھتا ہوں تو مجھے بھی کچھ کہنے کا خیال پیدا ہوتا
ہے اور جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ تاریخ اور نفسیات کے ایک متعلم
کا نقطۂ نظر ہے چاہے وہ شیعوں کے لئے مفید مطلب ہو یا اہل سنت
والجماعت کے لئے۔ چاہے اس کے جواب میں دونوں طرف کی
گالیاں ہوں۔ میں یہ بھی تو نہیں کر سکتا کہ بزمی صاحب کی طرح
قسمیں کھا کھا کر اپنی بے تعصبی اور غیر جانبداری کا یقین پڑھنے والوں

دلا دوں ۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ تعصب اور جنبہ داری کا تعلق بعض اوقات شعور کی اُس منزل سے ہوتا ہے جس سے ہم خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے ۔ میں نے دیکھا اور غالباً آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ کبھی کبھی برمی صاحب کی لہجہ کی تلخی اور طنز، شعوری یا غیر شعوری طور پر شیعہ جذبات نفرت کا پہلو بہت زیادہ نمایاں ہو کر اُن کے دعوئ خلوص کی غمازی کرنے لگتا ہے ۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اب سے دو برس پہلے جب مسئلہ خلافت و امامت پر ہر نام صاحب کا مضمون شائع ہوا تو اس جولائی ہی کے مہینہ میں برمی صاحب کا ایک مقالہ بھی اس کے جواب میں نکلا تھا ۔ میں نے اُسے پڑھا تھا اس میں منصب رسالت اور کار نبوت کی جی کھول کر توہین کی گئی تھی ۔ شیعوں کے لئے کہا گیا تھا کہ سیاست کو مذہب سے علیحدہ جانتے ہیں ۔ امام حسن ظالم تھے کیونکہ اُنھوں نے ایک قاتل کو سزا دی اور پھر مضمون ان تاریخی الفاظ پر ختم کیا گیا تھا ؛ اور میں اسے کبھی نہ بھولونگا، کہ شیعیت اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ۔ جولائی ۳۵ء کی آخری تاریخیں تھیں ۔ جب وہ مضمون میں نے دیکھا ۔ آخری جملہ پر میں نے کچھ لکھا ۔ پہلے تو یہی خیال تھا کہ نکالا میں بھیجونگا مگر پھر دیر میں

شایع ہونے کے خوف سے میں نے ایک دوسرے اخبار میں بھیجدیا (اخبار سدا لکھنؤ۔ ۲ اگست ۱۹۳۸ء) معلوم نہیں وہ آپ کی یا برنی صاحب کی نظر سے گذرا بھی یا نہیں۔ اس میں میرا لہجہ جذباتی ضرور تھا لیکن شاید غیر معقول نہ تھا۔ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے (جس میں کاہلی سب پر بالا ہے) میں پھر اس سلسلہ کا مطالعہ باقاعدہ نہ کر سکا اور صرف دلچسپی لینے والوں سے خبریں ملتی رہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں آپکے محاکمہ کے بعض اجزا عجلت میں دیکھے لیکن وہ بادل کے سایہ کی طرح دماغ میں رہے جنوری ۱۹۳۹ء کے نگار میں کسی آزاد خیال شیعہ کے قلم سے کوئی مضمون شائع ہوا۔ اس کی بڑی تعریفیں سنیں مگر بدقسمتی سے آج تک پڑھنے پر قادر نہ ہو سکا۔

یہ سب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر اس خط میں کوئی ایسی بات لکھ جاؤں جو زیر بحث آکر ختم ہو چکی ہو تو اس تکرار پر آپ یا کوئی اور صاحب خفا نہ ہوں مگر جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس طرح اب تک اس مسئلہ پر روشنی نہ ڈالی گئی ہوگی ورنہ بحث کی زیادہ گنجائش ہی نہ ہوتی۔ میں خود

نقل سے زیادہ عقل اور معتقدات سے زیادہ استدلال کی قدر کرتا ہوں لیکن نقل کو صرف نقل ہونے کی وجہ سے غلط نہیں سمجھتا اور روایت اور تاریخ کو محض اس لئے نہیں جھٹلا سکتا کہ وہ روایت کیوں ہے اور ہر روایت کو بے اعتبار سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں دکھتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو ماضی ہمارے لئے بے معنی ہو کر رہ جائیگا یہ اور بات ہے کہ ہم بعض موجودہ فلسفیوں کی طرح ماضی کی ضرورت ہی سے انکار کر دیں اور گذشتہ زمانہ کی باتوں کا تذکرہ ہی فضول سمجھیں پھر اس حالت میں تو میری اور آپ کی، ہر نام صاحب اور بنتی صاحب کی ساری کوششیں مسئلہ خلافت کے سلجھانے میں بیکار محض ہونگی۔ لیکن چونکہ اس بحث میں آپ لوگ حصہ لے رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کے مسائل پر تاریخ اور تنقید کی روشنی میں کچھ گفتگو کرنا بے وقت کی راگنی نہیں ہے۔ اسی لئے میں بھی اظہار خیال کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ تو واقف ہی ہونگے لیکن میں دوسروں کے لئے کیوں نہ بتاتا چلوں کہ ۱۸۴۸ء کے بعد سے فن تاریخ نویسی میں ایک اہم انقلاب ہوا کارل مارکس (Karl Marx) اور اُس کے شریک کار (Engels) نے فلسفہ تاریخ کا ایک نیا

نظریہ پیش کیا جس کا نام تاریخی واقعات کی مادی یا اقتصادی ترجمانی
(Materialistic of Economic Inter
-pretation of History)
رکھا اور بتایا کہ کوئی واقعہ اور کوئی تاریخی انقلاب جب کبھی ہوتا ہے
اس میں سرداری اور مزدوری کی کشمکش، امارت اور افلاس، دولت
کی غلط تقسیم اور طبقہ کی جنگ کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ہم
اسے دیکھ نہ سکیں مگر اس کا وجود ضروری ہے۔ اس کے علاوہ
اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں لیکن اقتصادی اور معاشی سبب ریڑھ
کی ہڈی کی طرح۔ تاریخ چند بکھرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں
تاریخ ایک وسیع معنی میں انسانوں کی مادی کشمکش کا مرقع ہے
تاریخ چند بڑے آدمیوں کی سوانح حیات بھی نہیں بلکہ انسانیت
مجموعی طور پر کہیں عوام و خواص کی جنگ کی شکل میں کہیں سرمایہ دار
اور مزدور کے حقوق کے تعین کی صورت میں متحرک اور لرزاں رہتی
ہے۔ چند حوصلہ مند انسانوں کی انفرادی خواہشات بعض اوقات
بڑی بڑی تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہیں۔ لیکن ایک مکمل تبدیلی
کی تہ میں کوئی اہم معاشی یا اقتصادی مسئلہ کروٹیں لیتا ہوا موجود
ہوتا ہے۔ سرمایہ دار کی ذہنیت اس وقت تک نہیں بدل سکتی

جب تک اُس کے خون میں ذرا بھی حرارت باقی ہے جب تک کہ اُسے بالکل یقین نہ ہو جائے کہ اب وہ دور ہی ختم ہو گیا اور اب کوئی امید پنپنے کی نہیں۔ عوام جو ہر طرح پریشان رہتے ہیں وہ اور زیادہ دیر میں اپنی حالت کا اندازہ کرتے اور تبدیلی چاہتے ہیں لیکن جب چاہتے ہیں تو وہی انقلاب کے علمبردار بن جاتے ہیں۔

فلسفۂ تاریخ کا یہ نیا نظریہ بہت سے لوگوں کو عجیب معلوم ہوگا لیکن جب واقعات اس پر منطبق کرکے دیکھے جائیں گے تو اُس کی صحت اور جامعیت کا یقین ہو جائیگا۔ میں نے اس پر ذرا آپ کا زیادہ وقت لے لیا۔ مگر میں آگے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔

شاید بھول جاؤں اس لئے ایک اصولی بات اور کہتا چلوں قرآن مجید کو اگر ہم الہامی کتاب مانیں تو کوئی بات ہی نہیں رہتی۔ اگر ہم محمد صلعم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سمجھیں تو بھی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آیت کے صرف اتنے ہی معنی نہیں ہیں جو اردو ترجمہ میں مولوی نذیر احمد صاحب یا مولوی مقبول احمد صاحب نے لکھ دیئے ہیں۔ میں بزمی صاحب کی طرح الفاظ کی ترجمہ ہی کو کافی

نہیں سمجھتا کبھی کبھی تشریح اور تفسیر بھی چاہتا ہوں جب یہ پڑھتا ہوں کہ قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم ہے تو میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کس طرح پڑھوں اور یہ مجھے قرآن میں نہیں ملتا۔ میں جب یہ پڑھتا ہوں کہ رسول نے ایک ساتھی کے ساتھ ہجرت کی تو واقعہ کی تفصیل اور ساتھی کا نام بھی جاننا چاہتا ہوں اور وہ قرآن میں موجود نہیں۔ میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ رسول کی کسی فتح کے لئے "فتح مبین" کے الفاظ استعمال کئے گئے تو ایک تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کی حیثیت سے میں وہ موقع جاننا چاہتا ہوں۔ بزرگ خدا نہ جانے کیوں اس پر مصر ہیں کہ الفاظ قرآن میں علی کی خلافت کا ذکر نہیں آیا ہے۔ انھیں اختیار ہے وہ آیتوں کو مانیں یا نہ مانیں۔ کیونکہ اُن میں علی کا نام نہیں آتا۔ وہ ماننے پر بھی مجبور نہیں کئے جا سکتے لیکن یہ آپ پوچھئے کہ وہ تاریخی واقعات سے کیوں انکار کرتے ہیں جبکہ وہ شیعوں کی گڑھی ہوئی روایتیں نہیں بلکہ علمائے اہل سنت کی تحریروں میں موجود ہیں۔

بہرحال ان مبادیات کی روشنی میں میں اس مسئلہ کو دیکھنا ہے میں پھر پہلے حصہ کی جانب آجاتا ہوں کہ فلسفہ تاریخ سے کام لیکر ہمیں اسلام کی ابتدا اور اشاعت پر غور کرنا چاہئے۔ اسلام کی

موجودہ شکل رسول مقبول نے دنیا کے سامنے پیش کی اور سب سے پہلے عرب میں وہ اصطلاح میں تو مذہب تھا لیکن عالم انسانیت کے نام آزادی اور امن و امان کا ایک چارٹر تھا سیاست، معاشرت اور روحانیت کا یہ نظام تیرہ سو سال قبل ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہوتا ہے اُسے ہم ایک طرح کی اشتراکیت کہہ سکتے ہیں۔ جو موجودہ اجتماعیت اور اشتراکیت کی طرح بہت زیادہ انتہا پسند تو نہیں لیکن اُس سے مماثل ضرور ہے۔ حریت، مساوات اور آزادی کا یہ پیام دنیا کے سامنے بالکل نیا تھا۔ افلاطون تخیل کے زور پر دنیا کو ایک حسین نظام ضرور دے چکا تھا لیکن رسولؐ اپنے عمل اور کردار سے، اپنے فلسفۂ حیات اور طریق معاشرت سے دنیا کو بالکل نئی چیز دے رہے تھے۔ اگر سختی سے دیکھا جائے تو رسول کو صرف ۲۳ برس کی مدت ملی جس میں انھیں عرب کے بہت سے بتوں کو نیست و نابود کرنا تھا۔ پتھر کے بت جو طاق کعبہ میں تھے وہ تو آسانی سے گر سکتے تھے لیکن جو دل میں گھر بنا چکے تھے اُن کا ڈھا دینا بھی رسول کا فرض تھا۔ عربوں کو ایک مشترک دشمن کے مقابلہ میں جا کر کھڑا کر دینا آسان تھا لیکن اُن کے دلوں سے قبیلہ پرستی اور شخصی امتیازات کا مٹانا کھیل نہ تھا۔

رسول نے اُن میں یگانگت اور بھائی چارگی کی روح پھونکی قبیلہ پرستی پر کاری
ضرب لگائی، نسلی امتیازات کی بنیاد اکھاڑ دی۔ وہ امیر اور غریب
سب کو ایک سطح پر لا کر انسانیت کو بلند کرنا چاہتے تھے وہ ایک ایسی
دنیا چاہتے تھے جہاں کوئی مخصوص طبقہ نہ ہو بلکہ صرف کار آمد اور مفید
انسان ہوں مختصر یہ کہ وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے اور اُسے
خدا کی جانب سے اپنے اوپر ایک فرض سمجھتے تھے رسول کی بڑھتی ہوئی
طاقت کے سامنے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی گردنیں جھک گئیں قبیلہ
اور نسل کا تفوق مٹنے لگا۔ اور بزرگی کی علامت یہ رہ گئی کہ جو خدا سے
جتنا زیادہ ڈرتا ہے اتنا ہی شریف ہے تاریخ ایسے کم انسان پیش
کر سکتی ہے جو اتنی مدت میں اس قدر کامیاب رہے ہوں، عرب
کی وحشت و بربریت ختم ہو چکی تو دنیا نے ذہنیت کا اندازہ لگایا
اور محمد عربی کے کام پر نظر ڈالی تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ اسلام کو صرف
اپنی زندگی تک کے لئے نہیں بلکہ آنے والی دنیا کے لئے ایک برکت
و بہبود کی چیز سمجھ کر چھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ خود تو کامیاب رہے مگر
ساتھ ہی اس کامیابی کو مستقل شکل دینے کے لئے یہ بھی چاہتے تھے
کہ اُن کے بعد اُن کا نظام قائم رہے۔ بالکل اسی طرح لوگ نسلی
امتیاز، شخصی جاہ و نمود، سرمایہ داری اور امیرانہ تفوق سے نفرت

کریں کوئی ایسی بات نہ ہو کہ جو بھی چیزیں عرب میں پیدا ہو جائیں جس طرح
رسول کا اس دنیا سے اٹھ جانا ضروری تھا چاہے کسی کو یقین ہو یا نہ ہو،
اسی طرح اسلام کا اصلی شکل ہی باقی رہنا اور دنیا کے لئے ایک پیام ثانی
کی حیثیت سے باقی رہنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے رسول کے پیش نظر اپنی
یا کسی کی زندگی سے زیادہ خدا کا پیام عزیز تھا۔ اسلام سے زیادہ انھیں
کسی سے محبت نہ تھی۔ رسول کسی شخص کی کامیابی اور خلافت سے زیادہ
اپنے مقصد کی کامیابی چاہتے تھے۔ اور اس کے مستقبل کے لئے انھیں
انتظام کرنا تھا۔

اس وقت یہ بحث چھیڑنا بیکار ہے کہ رسول عالم الغیب تھے یا
نہیں۔ ان سے غلطی ہو سکتی تھی یا نہیں میں تو کہتا ہوں کہ معمولی
معمولی تاریخ کے جاننے والے اور واقعات کی رفتار سے دلچسپی لینے
والے بہت آگے کے واقعات صحیح صحیح بتا دیتے ہیں۔ رسول عرب نے
اپنی زندگی ہی عربوں کے مطالعہ میں صرف کر دی تھی، وہ جانتے تھے
کہ انھیں کس طرح سدھارا جا سکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ عربی ذہنیت
میں کس طرح انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے رہے
ہوں گے کہ بہت سے لوگ کس طرح محض ضرورت وقت کے لحاظ
سے اسلام قبول کر رہے ہیں وہ حقیقتاً مار آستین ہیں۔ وہ موقع

ملنے پر رسول کے سارے نظام کو اُلٹ دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ وہ ان لوگوں سے ناواقف نہ تھے جو اسلام کی حقیقت سے بیخبر ہو کر کسی مصلحت سے اس جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے تھے وہ ان سے بھی واقف تھے جن میں روح اسلام پوری طرح سرایت کئے ہوئے تھی۔ وہ اپنے اعتماد کی قدر و قیمت جانتے تھے اور اپنے سچے ساتھی تلاش کرنے میں کوئی اہم غلطی نہ کر سکتے تھے۔ جب کوئی انقلاب شروع ہوتا ہے تو قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ روس میں صرف اشتراکیوں کو اہم جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ جرمنی میں نازی ہی سب سے قابل اور لائق ہیں کیونکہ وہی ہٹلر کے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ اٹلی میں فاسسٹوں کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کیا جاتا کیونکہ فاسستی نظام کے بقا کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ذہنیت بنانے کے لئے ایک اچھی مدت درکار ہے اگہ دین کا چراغ اس سلسلہ میں کام نہیں آسکتا۔ رسول بھی اسی پر عمل کر رہے تھے اور غالباً ہر ذی ہوش یہی کرےگا۔ عرب میں پریس اور پروپیگنڈے کی آسانیاں نہ تھیں اور رسول کو مساوات، اخوت اور آزادی کا بیج بوئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا تھا اس لئے اسی پالیسی کے تسلسل (Continuity) کی ضرورت تھی۔ ابھی عوام کی

ذہنیت اب تک اپنے پرانے رنگ پر فریفتہ تھی۔ ابھی وہ اپنے سرداروں
کے ماتحت تھے۔ ابھی اُن کی آنکھیں اپنے قبیلوں کے رشتوں
سے بھی بلند نہیں۔ کم لوگ ایسے تھے جنھوں نے اسلام کی روح
کو سمجھا تھا۔ رسول کو کام جاری رکھنے کے لئے ایک ایسے جانشین
کی تلاش تھی۔

میں برقی صاحب سے اس روایت پر متفق نہیں کہ رسول نے
کبھی علی کی خلافت کا ذکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ میں آپ کی تنقید کی تائید
کرتا ہوا۔ ایک سے زیادہ مواقع ایسے آتے ہیں جہاں رسول کا
منشا صداقت علی کو خلیفہ بنانے کے متعلق ظاہر ہوا۔ علامہ برقی
[illegible] دنبال ہونے کی وجہ سے برا سمجھتے ہیں۔ رسول کے
کے خاندان کا کوئی شخص رسول کا خلیفہ ہو لیکن اس کی کوئی وجہ
معقول نہیں نظر آتی کہ کیوں نہ ہو۔ علی کو اپنا جانشین بنانے میں
نسلی امتیاز اور کنبہ پروری کا جذبہ کارفرما نہ تھا' یہ داماد کی محبت
بھی نہ تھی (کیونکہ بقول حضرات اہل سنت حضرت عثمانؓ بھی تو داماد
تھے اور پھر دوہرے! اُن سے محبت کے اظہار میں یہی سلوک کیا
ہوتا!) یہ بھائی کا خیال نہ تھا۔ یہ بنی ہاشم کو بڑھانے کی ہوس نہ
تھی، جن چیزوں سے ڈر کر برقی صاحب تمام تاریخی حقائق سے

انکار کئے دیتے ہیں اُن میں سے کوئی نہ تھا۔ انھیں یہ خیال ہے
کہ اگر ہم علی کو خلیفہ مان لیتے ہیں تو نبی پر کنبہ پروری کا الزام آجائیگا۔
یہ رسول سے اظہار محبت کا بہت غلط طریقہ ہے۔ کیونکہ غیر جانبدار
تاریخ سمجھنے والے اور یوروپین مورخ یہ تو مانتے ہی ہیں کہ رسول
علی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے چاہے اس کے بعد وہ یہ بھی لکھدیں
کہ علی میں خلافت کی اہلیت نہ تھی۔ اُن کی تحقیقات کا پہلا حصہ
تاریخی حقیقت ہونے کی وجہ سے ماننا چاہئیے اور دوسرا ٹکڑا محض
رائے ہونے کی وجہ سے قابل بحث و نظر ہے۔ اس وقت اُن کی
قابلیت کا سوال بھی ابھی نہیں ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا ہے کہ رسول
علی کو خلیفہ بنانا چاہتے بھی تھے یا نہیں تو مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ
مسلمان مورخوں کی زیادہ تر کتابیں اور غیر مسلم مورخین کی کم و
بیش تمام کتابیں اس اعتراف سے بھری ہوئی ہیں یہ ایک کھلی
ہوئی حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بزمی صاحب اس سے کیوں انکار
کرتے ہیں حالانکہ آپنے ورہزیام صاحب نے اس کے کافی ثبوت بہم
پہونچادئے ہیں۔ اگر اس موقع پر بزمی صاحب کے خیالات کی نفسیاتی
تحلیل کر دی جائے تو زیادہ غیر موزوں نہ ہوگا۔ ان کو یقین ہے کہ
رسول نے علی کو خلیفہ بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ سنت

یوں سوچتے ہیں " اسے مان لیا جائے یا اس سے انکار کیا جائے"
پہلی صورت وہ صحیح مان ہی نہیں سکتے کیونکہ شیعہ بھی یہی کہتے ہیں
اور وہ اس غیر مسلم فرقہ کے ہمنوا نہیں ہو سکتے (ملاحظہ ہو اُن کا
مضمون جولائی ۳۵ء) لہذا انکار ہی پر سارا زور استدلال صرف
کر دینا چاہیے شیعوں سے دامن بچانے کے لئے اُنھوں نے تاریخی
حقائق بھی پس پشت ڈال دیئے اس کے لئے اُنھیں نسلی امتیاز اور
مطلق العنان حکومت کے نظریئے قائم کرنے پڑے۔ اُنھوں نے یہ
نہ سوچا کہ علی کا خلیفہ ہونا صرف شیعوں کا عقیدہ نہیں بلکہ رسول
کی خواہش کی تکمیل ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا حقیقت یہ ہے کہ
نیازی صاحب تمام دنیا کے مورخین کے خلاف اب تیرہ سو برس بعد
ایک نئی بات کہہ کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ رہا علی کی اہلیت کا
سوال میں اس کی طرف اشارے کرتا جاؤنگا۔ میرا مستقل مضمون
سرفراز لکھنؤ ۲۶ رجب ۱۳۵۵ھ میں موجود ہے وہ دیکھا جا سکتا ہے۔
اگر مجھے معاف کیجئے تو میں کہونگا کہ فاضل مضمون نگار فلسفہ
تاریخ اور سیاسیات کے مبادیات سے بھی چشم پوشی کرنا چاہتے ہیں
علی کے خلیفہ ہونے میں اسلام کا کوئی اصول نہیں ٹوٹتا کہ وہ رسول
کے منشا ہی پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ

علی اور اولادِ علی کے خلیفہ ہونے میں اسلام سے کوئی انحراف نہیں ہوتا
وہ تو علوم شرقی و مغربی کے عالم ہیں انھیں مشرق کی تاریخ کو مغرب کے
فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ تاریخی حقائق جھٹلانے سے
اسلام کی برتری ثابت نہیں ہوسکتی۔ نئی تاویلات قائم کر کے عقل
عمومی کو پیش کرنا کمال نہیں بلکہ واقعات کی صحت اور غلطی پر حکم
لگا کر بزرگوں کی غلطی (اگر کوئی ہوئی ہو) کا مان لینا ہی اسلام کی
صداقت کو روشن کر سکتا ہے۔ رسول کے منشا کو منشا نہ سمجھنے سے
بہتر یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے جذبات اور خواہشات عقل کی کسوٹی
پر پرکھ لئے جائیں کہ انھوں نے ایسا کیوں نہ ہونے دیا۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اپنے بعد علی کو مسلمانوں کا رہبر دیکھنا
چاہتے تھے اور اُس کے لئے معقول وجہیں تھیں۔ مذہبی، سیاسی
اور نفسیاتی۔ علی ہی کے خلیفہ بننے میں اسلام کی بہتری تھی۔ اسی
طرح رسول کی حکمت عملی کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ اسی طرح
عوام کی داخلی اصلاح ہوسکتی تھی۔ کچھ دنوں تک اس کی ضرورت
تھی۔ سیریا، ایران اور یروشلم کچھ دن بعد فتح ہوسکتے تھے اور اگر
یہ کہا جائے کہ اسلام کا پیغام پہنچانا ضروری تھا تو اس کے دوسرے
ذرائع ہوسکتے تھے۔ پہلے جتنے لوگ اپنے پاس تھے انھیں حقیقی

اسلام سے باخبر کر کے اس عظیم الشان جمہوریت کا ممبر بنانا تھا جو
آزادی اور مساوات کی پابند تھی۔ یہ بعد میں دوسری جگہ کے
لوگ بھی اس سے اچھی طرح واقف ہوتے۔ اس موقع پر شان
اور ہر اشکی کے سیاسی عقائد کے اختلافات بھی ملاحظہ فرمائیگا
علی کی شکل میں دنیا کے سامنے وہ شخص پیش کیا جا رہا تھا جس
سے اسلام سے غداری کا امکان نہ تھا۔ علی میں کوئی خرابی نہ تھی
اُن کی ساری عمر انقلاب پیدا کرنے والے کے ساتھ گذری تھی اور
کبھی بھی رسول نے اُن کی وفاداری پر شک نہیں کیا۔ جہاں کہیں اُن
کی سب سے بڑی ضرورت تھی ہجرت کی رات کو بستر پر تلواروں میں سونا
وہاں انھیں پر بھروسا کیا۔ علی سب سے زیادہ لڑائیوں میں شریک
رہ کر اسلام کی حفاظت کرتے رہے۔ ہاں جب رسول کے بعد کی
لڑائیاں دفاع سے ہٹ کر جارحانہ بن گئیں تو علی تعاون نہ کر سکے
اور اس فاتح اعظم کی تلوار مدت تک زنگ آلود ہوتی رہی انھوں
نے رسول کی جانب سے صلحنامے لکھے انھوں نے مختلف ممالک کے وفد
بھیجے ہوئے رسول کی طرف سے خط لکھے۔ انھوں نے یمن جا کر
اسلام کا پیغام اور آیات قرآنی پہونچائیں۔ انھوں نے رسول کے
افعال اور کردار کی پیروی اس طرح کی جیسے اونٹ کا بچہ اپنی

ماں کی پیروی کرتا ہے (بقول علی) رسول کے بعد بھی اُن سے غداری نہ ہوئی کیونکہ یہ اُن کی فطرت ہی میں نہ تھی۔ وہ اصول اسلام سے اختلاف نہ کر سکتے تھے چاہے انھیں مسلمانوں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ حضرت ابو بکر کے خلیفہ ہو جانے پر جب ابو سفیان نے علی کی طرفداری میں مدینہ کی گلیاں سواروں اور پیادوں سے بھر دینے کا وعدہ کر رہے تھے تو علی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ابو سفیان اسلام کے دوست نہیں ہو سکتے اس انقلاب میں جسے ہم اور آپ اسلام کہتے ہیں رسول کے بعد علی کا حصہ سب زیادہ نمایاں تھا۔ وہ اس کے معمولی سے معمولی اجزا سے واقف تھے مگر ان کے لئے کچھ کیا تو کیا نہ کیا ؟

اسے دوسری طرح بھی دیکھئے رسول کس کے خلیفہ ہیں جب عام اسلام اور انسانیت کا بھلا دیکھ سکتے تھے۔ کتنی شان سے ہم انھیں دو سنت میں دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت ابو بکر بوڑھے تھے اور رسول کے ہم عمر۔ ہجرت میں رسول کے ساتھ ہونے کے علاوہ اُن کا کوئی ایسا زبردست کارنامہ نہیں جس سے اُن کی سیاسی بالغ نظری اور ذہانت کا پتہ چل سکے۔ حضرت عمر اپنے انتہائی انہماک اور جوش کی وجہ سے مقاصد اسلام کی ترویج کے لئے وہ ذرائع اور

حکمتیں اختیار نہ کر سکتے تھے جو رسول کا منشا تھا۔ وہ مسلمان تو بہت بنا سکتے تھے لیکن روشنیٔ اسلام دھندلی ہوتی جا رہی تھی مسلمانوں کی یہ زیادتی غیر منہضم غذا کی طرح تھی مفتوح ممالک کے زیادہ تر لوگ یوں ہی مسلمان ہوتے جا رہے تھے اُن کے سامنے فلسفہ اسلام کی خوبیاں نہ تھیں۔ رسول کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں اور حضرت عمر کی لڑائیاں ملک گیری کے جذبات سے معمور۔ رسول ایک نفسیات کے جاننے والے کی طرح حضرت عمر کی یہ صلاحیتیں چار چھ سال پہلے دیکھ سکتے تھے حضرت عثمان کا کوئی کارنامہ بھی رسول کے پیش نظر نہ تھا حضرت علی عمر میں کم ہونے کے علاوہ مجموعی حیثیت سے سب سے زیادہ رسول کے مشابہ تھے رسول انھیں پہ زیادہ بھروسہ رکھتے تھے۔ بزمی صاحب مانیں گے ورنہ بہت سی حدیثیں پیش کرتا جو رسول کی زبان فیض ترجمان سے علی کے لئے نکلیں اور جنھیں بنی امیہ کے ستر ہزار ممبروں اور مسجدوں کے پروپیگنڈے بھی نہ مٹا سکے رسول غلط یا صحیح علی کو سب سے زیادہ اہل جانتے تھے اور اُنھیں کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے تاکہ وہ اہل عرب کو اسلام کی تعلیمات سے اچھی طرح باخبر بنا سکیں، اخوت اور مساوات سے سرشار کر دیں میں پھر کہتا ہوں کہ ابھی رسول کی پالیسی کے جاری رہنے کی بڑی ضرورت تھی۔ معمولی سی تبدیلی

بھی عوام کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر دوسری طرف لگانے کے لئے کافی
تھی۔ مثال کے طور پر لیجئے۔ رسول کے زمانہ میں باقاعدہ فوج نہ تھی
ہر مسلمان یا ہر وہ شخص جو اس انقلاب کا حامی تھا، اپنی عمر کے لحاظ
سے فوج کا سپاہی تھا۔ اور ضرورت کے وقت کہیں بھیجا جا سکتا
تھا۔ (آج کل بھی روس وغیرہ میں ہر شخص سپاہی ہے) حضرت
عمر نے اسلام کو ایک عسکری نظام دیا اور اُسے مولانا شبلی مرحوم
نے بہت خاص طور پر پیش کیا ہے۔ میں اس تبدیلی کو نظرانداز نہیں
کر سکتا کیونکہ اب گویا اسلامی جماعت باقاعدہ ایک سرمایہ دار
اور استعمار پسند حکومت بن گئی تھی جو اہل عالم پر عرصہ زندگی تنگ
کر سکتی تھی۔ رسول ہی کی پالیسی کو جاری رہنا چاہئے تھا اور علی سے
زیادہ کوئی اہل نہ تھا۔ رسول کے اس منشا کو عرب کے لوگ نہ سمجھ سکے
اور غالباً اس ابتدائی حالت میں سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ مگر مجھے تو رونا
اس کا ہے کہ ہم آج بھی جبکہ دنیا نے ترقی کی بڑی منزلیں طے
کر لی ہیں اس اعتراف سے گھبراتے ہیں۔ عرب کے عوام رسول کی
اس مصلحت سے بیخبر تھے وہ عرب کے سربرآوردہ حضرت کو برسراقتدار
پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی نظر میں اہلبیت کا سوال نہ تھا بلکہ
رسول کے اُٹھتے ہی اُن کی نگاہیں بڑے بڑے قبیلوں کے بوڑھے

سرداروں کی طرف اٹھ گئیں اور جب بے ہوش اور پرجوش طریقہ
پر رسول نے قبیلہ پرستی پر تیشہ زنی کی تھی اور اُسے اپنی سیاسی
پالیسی بنا رکھا تھا وہ مکمل طریقہ پر ذہن نشین نہ ہو سکا مسلمانوں کو
یہ دھوکا ہرگز نہ کھانا چاہیے کہ اسلامی جمہوریت کے لئے اس وقت
انتخاب ضروری تھا۔ اگر انتخاب انتخاب کی طرح ہوتا تو کوئی رونا
نہ تھا، عوام پر یہ مسئلہ رسول نے چھوڑ دیا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی
مگر وہاں تو تھوڑے سے لوگ عوام کی باگ ہاتھ میں رکھتے تھے
جب اُن سرداروں نے ایک رائے قائم کرلی تو عام افراد نے
بھی اسی کو منظور کرلیا۔ اُن کی نہ تو انفرادی رائے تھی اور نہ وہ
رائے کے قابل سمجھے گئے۔ ہمارے سامنے تاریخ وہ چند نام
پیش کر دیتی ہے جنھوں نے حضرت ابوبکر کے انتخاب میں حصہ
لیا۔ اس کے بعد عوام ساتھ ہو گئے۔ یہ انتخاب کوئی جمہوری نظام
قائم کرنے کے لئے نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ رسول کا منشا بدلنے اور
فیصلہ مسترد کرنے کے لئے پہلے ہی روز انصار و مہاجرین کی تفریق
پیدا ہو گئی اور مقصد رسول کی ترویج کرنے والے اسلام کی روح
سے لوگوں کو آشنا بنانے والے کی تلاش نہ ہوئی۔ کامل ابن
اثیر اور طبری دونوں میں مل جائیگا کہ انصار و مہاجر کے اس

جھگڑے میں حضرت ابوبکر نے اٹھ کر کہا کہ قریش پر قریش کے علاوہ
کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر یہ نسلی امتیاز اور ذاتی شوق نہ تھا
تو اور کیا تھا؟ حضرت ابوبکر کے پدر بزرگوار نے اس انتخاب کی
خبر سن کر یہ سوال بھی کیا "کیا بنی عبد مناف اور بنی مغیرہ نے
ان باتوں کو مان لیا" دیکھئے عام افراد کے ذہن کتنی تیزی سے قبیلوں کی
طرف بھٹک جاتے تھے۔ بنی عبد مناف اور بنی مغیرہ دونوں مسلمان
تھے لیکن جناب ابو قحافہ کو اندیشہ تھا سیدھی اور پھر اگر یہ اتفاق
کا سلسلہ بھی باقی رہتا تو ایک بات ہوتی مگر حضرت ابوبکر کے بعد
پھر وہی نامزدگی ہوئی جس سے جمہوری دماغ گھبراتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] علی کی نامزدگی کی [illegible] پر رسول کا ایک دوست [illegible]
اور حضرت عمر کی نامزدگی پر [illegible] لفظ نہ کہا گیا۔ حضرت عمر کا
نامزد ہونا مطلق العنانی کے سوا کچھ اور تھا۔

آپ نے کسی جگہ بیس دو وجہیں لکھی ہیں جو علی کی دشمنی
کا سبب بن گئی ہیں۔ میں دو ایک کا اور اضافہ کرتا، مگر وہی کیا
کم ہیں جو آپ نے لکھی ہیں۔ میں آپ سے متفق ہوں میں بھی اسی
نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ رسول علی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے مگر وہ
نہ ہو سکا۔ رسول کا اپنے مشن کی کامیابی کے لئے کسی اور کا نام

لینا ممکن نہ تھا اور یہ نام لینا جذباتی نہ تھا بلکہ اس کے سیاسی وجوہ
بھی تھے اس انقلاب کی تکمیل اسی طرح ہو سکتی تھی۔ اگر رسول علی کے
علاوہ کسی اور کے متعلق سوچتے یا بالکل نام ہی نہ لیتے تو ہم یہ سمجھتے
کہ رسول نے اسلام کے استحکام اور اپنے سیاسی اور مذہبی، روحانی
اور معاشرتی نظام کی بقا کے لئے کچھ نہ کیا۔ اگر اسلام سچا مذہب تھا
اور اُس کی اشاعت محمد عربی اپنا فرض سمجھتے تھے تو اُسے پھیلنا چاہئے
تھا۔ چاہے اُس پر جمہوریت کے چند ادنیٰ اصول قربان ہی ہو جائیں
کیونکہ وہ تو روزانہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور مقسدوں کی کامیابی
کے لئے اُن میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ میرے اس جملہ کی صدائے
بازگشت آپ کو لینن اور ٹراٹسکی کی تحریروں میں سنائی دیگی اور
ایک عملی مثال حضرت عمر کی نامزدگی میں ملیگی۔ ہٹلر نازیت کی ترقی
کے لئے صرف گوئرنگ اور گوئبلس پر بھروسا کر سکتا ہے۔ عوام
کی ذہنیت سے اُسے خطرہ ہے اس لئے اُن پر بھروسا نہیں کر سکتا
رسول عوام کی لاعلمی سے ناواقف نہ تھے۔ وہ اتنا بڑا کام غیر تعلیمیافتہ
طبقہ اور اسلام کی حقیقت سے بیخبر عوام پر نہیں چھوڑ سکتے تھے اُن کے
لئے ضروری تھا کہ اپنی انگلی سے اُس شخص کی جانب اشارہ کرتے
جائیں جو سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا اور اُنھوں نے یہی کیا بھی۔

رسول کا یہ تعین خلافت اور نامزدگی نتائج کے لحاظ سے بہت
بڑی باتیں ہیں۔ کیا آپ پر منشائے رسول سے اس انحراف کا
اثر واضح نہیں؟ حضرت ابوبکر کا زمانہ رسول سے بہت قریب ہونے
کی وجہ سے کسی قدر خاموش تھا۔ اگرچہ سوا دو برس کی مدت میں
بغاوتیں بھی ہوئیں اور اسلام کی خدمت بھی۔ معاویہ بن ابی سفیان
نے قدم بھی جمادئے اور علی اور فاطمہ کی توہین بھی کی گئی۔ اس کے
بعد حضرت عمر نے اسلام کی خدمت پر کمر باندھی لیکن ملک گیری
شروع ہوگئی۔ بدو عربوں میں اسلام کے مقاصد کے خلاف
سرمایہ داری اور شہنشاہیت کا شوق پیدا ہوگیا اور سب سے
بڑی بات یہ ہوئی کہ بنی امیہ نے اپنا پودا سرزمین اسلام پر
مضبوط طور پر لگالیا۔ ممکن ہے آپ یا بزمی صاحب بنی امیہ کے
اس دخل کو نظر انداز کرجائیں لیکن نتائج پر نظر کرکے میں اسے
بہت اہم سمجھتا ہوں۔ بنی امیہ کی نسلی ذہنیت کو اپنے تصور
میں رکھ کر تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجئے۔ رسول کو ان لوگوں سے
نسلی یا ذاتی دشمنی نہ تھی۔ وہ صرف ظاہرداریوں پہ نہ جاتے
تھے۔ اُن کی تیز نگاہ باطن کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ وہ بنی امیہ میں
اپنے سیاسی اور معاشرتی نظام سے اختلاف کرنے کی پوری

قوت دیکھ رہے تھے۔ ہم لوگ ہمیشہ اُن سے نبی کی تاکید سنتے تھے
کہ ہم سے کون ہے؟ اور پر غورت بنتی جارہی تھی مگر چند دنوں میں دیکھ لیا
کام کر رہے تھے حضرت عثمان کی خلافت کا پوچھنا ہی کیا! زمین اور
آسمان سب کچھ بنی امیہ کا تھا۔ اور جب میں بنی امیہ کا لفظ استعمال
کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اسلام کو اسلام
ہی کے خلاف آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے جنہیں حصول
جاہ کے سامنے اسلام کی کوئی پرواہ نہ تھی اور یہ بنی امیہ ہی ہیں۔
اگر آپ کو میری بات ماننے میں تامل ہو تو ڈوزی یا پروفیسر نکلسن
یا اسی اور یورپین صاحب قلم کی تصنیف دیکھ لیجئے وہ سب
کے سب متفق ہیں کہ اسلام کی باگ کا بنی امیہ کے ہاتھ میں آنا حقیقتاً
اسلام کی شکست اور پرانے عربی طرز معاشرت کی فتح تھی۔ رسول
اسلام کو اسی چیز سے بچانا چاہتے تھے۔ علی کے سوا اسے کسی نے
نہ سمجھا تھا۔ مسلمانوں کا جھنڈا ایران اور شام میں لہرائے یا اسپین
اور مصر میں مگر رسول کے حقیقی مقصد سے بے خبری قدم قدم پر ظاہر
ہو رہی تھی۔ روپیہ تھا۔ دولت تھی قیصر و کسریٰ کی شان و شکوہ
تھی، فوجیں تھیں۔ لیکن اسلام نہ تھا۔ صرف ایک ڈھانچہ باقی
رہ گیا تھا۔ روح مردہ ہو چکی تھی۔ مساوات اور اخوت کی کمی کو

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی سادہ زندگی نے پورا نہ کیا۔ رسول
ان چیزوں کو کچھ دن پہلے سے دیکھ رہے تھے اور اس کے لئے کسی
الہام کی ضرورت نہ تھی بلکہ دقّتِ نظر کافی تھی۔ ان تبدیلیوں سے
بچانے کے لئے رسول نے علی اور آل علی کو اپنا جانشین بنانا چاہا
تھا۔ اسی لئے وہ اپنا اعتماد ان لوگوں کو سونپنا چاہتے تھے۔
معلوم نہیں برنی صاحب عقل عمومی کو بیچ میں لاکر کیوں
بدنام کر رہے ہیں وہ کیوں اسے نسلی امتیاز سمجھتے ہیں۔ وہ اسے
اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ جو رسول کے مقاصد کو سب سے
اچھی طرح اُجاگر کر سکے وہ خلیفہ ہو رسول کی سمجھ میں یہی آیا تھا
کہ اُن کے خاندان والے اس کے سب سے زیادہ موزوں ہونگے
اُنھوں نے کہدیا اور دنیا اسے جھٹلا نہ سکی۔ تاریخ کے اوراق
شاہد ہیں کہ اُن کے خاندان کے لوگ کم سے کم بارہ پشت تک
دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم تھے جس وقت وہ تھے
اُن کے مقابل میں کوئی دوسرا نہ آسکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ
انھیں موقع نہ ملا اور اُن کی عمریں قیدخانوں کی تاریکیوں میں
ختم ہوگئیں۔ یہ تو کنبہ پروری اور نسلی تفوق نہ ہوا بلکہ ایک
بہت بڑی بات ہوئی اور وہ یہ کہ جو سب سے زیادہ اہل ہو وہی

یرا جانشین ہو۔ اُنھوں نے دوسری طرح کہا کہ میرے خاندان کے
لوگ میرے جانشین ہوں۔ کیونکہ وہی اس کے اہل ہیں۔ صرف کسی
نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دشمنی کا پیدا ہو جانا۔ میری سمجھ
میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول ایک مدت مقرر کرنا چاہتے
تھے۔ جس میں اُن کا خیال تھا کہ اسلام کی روح اور حقیقت عوام
کی سمجھ میں آجائیگی اور وہ اُن کے مطالعۂ وقت کے حساب سے
بارہ پشتوں تک جاتی تھی غالباً یہ مدت ایک انقلاب کی کامیابی
کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس لئے اُنھوں نے بارہ خلافتوں کا
تذکرہ بھی کر دیا۔ بزمی صاحب اسے غور سے نہیں دیکھنا اور اگر دیکھتے
ہیں تو کہنا نہیں چاہتے۔ بلکہ چند بیش پا اُفتادہ الفاظ سے کام
لیکر، جن سے آج نفرت کی جاتی ہے رسول کے اس اہم فیصلہ
کی وقعت پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں۔ نسلی امتیاز اور خاندانی تفوق
شخصیت پرستی اور قبیلہ پرستی کا اسلام دشمن تھا لیکن قابلیت اور
عمل کا نہیں، اہلیت اور علم کا نہیں، رسول اسپرٹ کو دیکھتے تھے
الفاظ کو نہیں، بزمی صاحب الفاظ کو دیکھتے ہیں۔ وہ اس پر ماتم
کرتے ہیں کہ رسول کے خاندان کے لوگ خلیفہ کہے جاتے ہیں
اس پر نہیں روتے کہ رسول کے مرتے ہی پھر قبیلہ پرستی یعنی

بھیانک شکل میں آگئی، وہ اس پر افسوس کرتے ہیں کہ رسول نے اپنے خاندان کے قابل افراد کا نام کیوں لے لیا۔ انھیں اس کا رنج نہیں کہ تخت خلافت پر کیسے کیسے لوگ جلوہ افروز ہوئے اور اسلام کی کیا شکل ہو گئی کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حقوق کا سلب ہو جانا عصر حاضر میں سمجھ میں آنے کی بات نہیں میں پھر عرض کرتا ہوں کہ رسول کا منشا علی کو اپنا جانشین بنانے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی پالیسی کا تسلسل چاہتے تھے۔ عرب کے لوگوں نے علی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ وہ دوسری طرف جانا چاہتے تھے اور خلفائے اسلام انھیں اسی طرف لے گئے۔ رسول عوام پر بھروسہ نہ کر سکتے تھے کیونکہ اُن میں ذہنی بیداری اور سیاسی عقل نام کو نہ تھی

رسول کے اس منشا کو الوہی خلافت سمجھا جائے۔ اس پر میں کچھ زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ میرے پیش نظر قرآن کی وہ آیت ہے جس میں صاف لکھا ہے کہ رسول کا ہر کام خدا کے حکم کے بعد ہوتا ہے (وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ) اگر ہم قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہیں تو رسول کا الٰہی پیامبر ہونا بھی ممکن ہے اور علی کا الوہی خلیفہ بھی۔ ورنہ یہ بحث ہی باقی نہیں رہتی۔ جب قرآن خدا کا

کلام ہی نہیں تو پھر نہ کوئی خدا کا رسول ہے اور نہ الٰہی خلیفہ!

بزمی صاحب نے ایک دلچسپ مگر غیر ضروری بحث اور چھیڑ دی ہے اُنھوں نے ڈکٹیٹر (Dictator) یعنی آمر اور آٹو کریٹ رولر (Autocrat Rulers) یعنی مطلق العنان بادشاہ کا جو امتیاز پیش کیا ہے وہ اُن کے وسعت مطالعہ کا پتہ دیتا ہے اور میں اُس سے متفق ہوں۔ لیکن انھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ سیدھے سادے مسلمانوں کو ان چیزوں سے مرعوب کرنا کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اسلام کے خلفار کو نہ تو ڈکٹیٹر بننا تھا اور نہ آٹو کریٹ رولر۔ وہ جو کچھ بن جائیں یہ دوسری بات ہے لیکن جہاں تک اسلامی سیاست کا تعلق ہے وہ ڈکٹیٹر نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ عوام کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ بلکہ اپنی قوت عمل اور علم سے عوام کو اس سطح پر لانے پر مامور تھے۔ جہاں اسلام ہر فرد بشر کو لے آنا چاہتا ہے۔ وہ آٹو کریٹ رولر بھی نہ تھے۔ کیونکہ اُن کے لب دہن سے نکلے ہوئے الفاظ قانون نہ بن سکتے تھے۔ اُن کو قانون (قرآن) اور احادیث رسول کا پابند ہونا بھی ضروری تھا۔

اس طرح آپنے دیکھا کہ علی اور آل علی بارہ پشتوں تک کے لئے رسول کے حکم کے مطابق ایک انقلاب کے حامی اور کارکن بنکر

مطلق العنان بادشاہ نہ بن سکتے تھے۔ اور نہ رسول ابد الآباد تک
نسلی امتیاز قائم کر گئے تھے۔ اسلام ترقیوں اور تبدیلیوں سے نہیں
روکتا لیکن اسلام اسلام کو مٹانے سے ضرور روکتا ہے۔ نیز جی
صاحب نے اور بہت سی باتیں ضمناً لکھی ہیں جو جواب چاہتی تھیں
لیکن میں اُن کے مضمون کا جواب نہیں بلکہ آپ کو خط لکھ رہا ہوں
یہ تو اُن کا مضمون پڑھکر بعض خیالات کے پیدا ہوئے پر جی چاہا
کہ آپ ہی سے گفتگو کروں اور اگر آپ بہت زیادہ غیر مناسب نہ
سمجھیں تو "نگار" کے پڑھنے والوں کو بھی شریک کر سکتے ہیں کیونکہ
میرا خیال ہے کہ جو نقطۂ نظر میں نے پیش کیا ہے۔ وہ عقل اور
اسلام کے مطابق ہے۔

خدا کرے اس مسئلہ پر کچھ بے لوث سوچنے والے مل جائیں
کیونکہ یہ محض ایک تاریخی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت
اس طرح اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ ہم ایک نظریۂ انقلاب کو
جو رسول نے پیش کیا تھا قبول کر کے چلانا بھی چاہتے ہیں یا نہیں
اگر واقعی رسول مقبول کوئی اچھی چیز دے رہے تھے تو اُن کے
منشاء کے مطابق اُس کی اشاعت کے ذرائع پر عمل بھی ضروری
تھا ورنہ یوں تو جو کچھ ہو گیا اس کی بحث ہی بیکار ہے۔ نیز جی صاحب نے

تع فرمایا ہے کہ یہ تمام مضموں نگاری علماء اور عوام پر ذرا بھی اثر نہیں ڈال سکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہم اپنے بزرگوں کی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔

میں نے آپکا بڑا وقت لیا اور اگر آپنے اسے "نگار" کے حوالہ کر دیا تو "نگار" کے کئی صفحے بھی لیگا۔ مگر کیا کروں چپ بھی نہ رہا گیا میرے پاس علاوہ بزمی صاحب کے مضمون کے کوئی کتاب نہ تھی۔ زیادہ تر یادداشت پر بھروسہ کرکے لکھا ہے۔ خدا کرے آپ کو پسند آئے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہونگے۔ والسلام۔

احتشام رضوی تاہلی ایم۔اے

۱۴ جولائی ۳۷ء